منتخب غزلیں

(ولی سے فیض تک)

اترپردیش اردو اکادمی

لکھنؤ

سلسلۂ مطبوعات : ۴۰۷

منتخب غزلیں

اتر پردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

© اتر پردیش اردو اکادمی

منتخب غزلیں

مجلس مشاورت
پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر شبیہ الحسن
پروفیسر حکم چند نیر، پروفیسر عتیق صدیقی
پروفیسر محمد عقیل رضوی

تیسرا ایڈیشن : ۱۹۹۹ء
تعداد : دو ہزار
قیمت : سات روپے

U
851.08
M27M-1

Rs. 7-00

محمد نجم الحسن، سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے میسرس پرکاشن کیندر، سیتاپور
روڈ، لکھنو سے چھپوا کر وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ سے شائع کیا۔

پیش لفظ

اتر پردیش اردو اکادمی کے قیام کا بنیادی مقصد اردو زبان و ادب کی بقا اور اس کی تعلیم کا فروغ ہے۔ نئی کتابوں کی اشاعت اور اردو کے کلاسیکی سرمائے کے تحفظ کی طرف اکادمی کی توجہ تو ہے ہی اردو تعلیم کے فروغ پر بھی خاطر خواہ دھیان دیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں اکادمی کے دو اقدام بہت اہم ہیں جن کو اردو حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ ان میں سے ایک تو ہے اردو پڑھنے والے طلبہ کو وظائف دینے کی اسکیم اور دوسرا ہے یونیورسٹی سطح کی درسی اور حوالے کی کتابوں کی کم سے کم قیمت میں طلبہ کو فراہمی۔

اکادمی نے طلبہ کی ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے جو کتابیں شائع کی ہیں ان کی قیمت لاگت سے بھی کم اس لئے مقرر کی جاتی ہے کہ ہر ایک طالب علم کے پاس اس کی اپنی کتاب ہو اور درس و تدریس کے وقت متن سامنے رہے۔ اکادمی نے جب تک یہ کام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا طلبہ کو کتابوں کی تلاش میں در در بھٹکنا پڑتا تھا، لائبریریوں کے بار بار چکر لگانا پڑتے تھے اور اکثر کتابوں کے حصول میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اکادمی کی کوششوں کی بدولت ان کو اس سعیٔ رائیگاں سے فرصت مل گئی۔

اکادمی کی تیار کرائی ہوئی درسی کتابوں کو اتر پردیش میں ہی نہیں، دوسری ریاستوں کی یونیورسٹیوں میں بھی پذیرائی حاصل ہوئی ہے اور انھیں نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۳ میں شائع ہوا تھا۔ امید ہے یہ تیسرا ایڈیشن بھی قبول عام حاصل کرے گا۔

شمیم رضوی

(ڈاکٹر) شمیم رضوی

چیرپرسن

ترتیب

ولی	۵
سودا	۱۲
درد	۱۷
میر	۲۲
ناسخ	۵۶
آتش	۶۲
مومن	۷۴
غالب	۸۶
حالی	۱۱۱
شاد	۱۱۷
چکبست	۱۲۸
اصغر	۱۳۳
اقبال	۱۴۱
فانی	۱۴۸
حسرت	۱۶۰
یاس	۱۶۹
فراق	۱۷۷
فیض	۱۹۲

کوچۂ یار عین کاسی ہے
جوگیِ دل وہاں کا باسی ہے

پی کے بَیراگ کی اُداسی سوں
دِل پہ میرے سدا اُداسی ہے

اے صنم! تجھ جبیں اُپر یہ خال
ہندوُے ہردوار باسی ہے

زُلف تیری ہے موج جمنا کی
تِل نزک اُس کے جیوں سناسی ہے

یہ سیہ زُلف تجھ زنخداں پر
ناگنی جیوں کنوے پہ پیاسی ہے

جس کی گُفتار میں نہیں ہے مزا
سُخن اُس کا طعامِ باسی ہے

اے ولی! جو لباس تن پہ رکھا
عاشقاں کے نزک لباسی ہے

(۲)

کیا مجھ عشق نے ظالم کوں آب آہستہ آہستہ
کہ آتش گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شبِ خلوت میں گلرو سوں
خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

مرے دِل کوں کیا بے خود، تری انکھیاں نے آخر کوں
کہ جیوں بے ہوش کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

ادا و ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سوں
کہ جیوں مشرق سے نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

ولی! مجھ دِل میں آتا ہے خیالِ یارِ بے پروا
کہ جیوں انکھیاں منیں آتا ہے خواب آہستہ آہستہ

(۳)

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

نہ چھوڑے محبت دمِ مرگ تک
جسے یارِ جانی سوں یاری لگے

نہ ہووے اُسے جگ میں ہرگز قرار
جسے عشق کی بے قراری لگے

ہر اک وقت مجھ عاشقِ زار کوں
پیارے! تری بات پیاری لگے

ولی سوں کہے تو اگر اک بچن
رقیباں کے دِل میں کٹاری لگے

(۴)

شغل بہتر ہے عشق بازی کا کیا حقیقی و کیا مجازی کا
ہر زباں پر ہے مثلِ شانہ مدام ذکر تجھ زُلف کی درازی کا
آج تیری بھواں نے مسجد میں ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا
گر نہیں رازِ عشق سوں آگاہ فخر بے جا ہے فخرِ رازی کا
اے ولی! سرو قد کو دیکھوں گا وقت آیا ہے سر فرازی کا

(۵)

شرابِ شوق سیں سرشار ہیں ہم کبھو بے خود، کبھو ہُشیار ہیں ہم
دو رنگی سوں تری، اے سروِ رعنا! کبھو راضی، کبھو بے زار ہیں ہم
ترے تسخیر کرنے میں پری جن! کبھو ناداں، کبھو عیّار ہیں ہم
صنم! تیرے نین کی آرزو میں کبھو سالم، کبھو بیمار ہیں ہم
ولی! وصل و جُدائی سوں صنم کی کبھو صحرا، کبھو گل زار ہیں ہم

(۶)

عشق، بے تابِ جاں گدازی ہے حُسن، مُشتاقِ دِل نوازی ہے
اشکِ خونیں سوں جو کیا ہے وضو مذہبِ عشق میں نمازی ہے
جو ہوا رازِ عشق سوں آگاہ وہ زمانے کا فخرِ رازی ہے
جا کے پہنچی ہے حدِّ ظلمت کوں بس کہ تجھ زُلف میں درازی ہے
اے ولی! عیشِ ظاہری کا سبب جلوۂ شاہدِ مجازی ہے

(۷)

مُفلسی سب بہار کھوتی ہے مرد کا اعتبار کھوتی ہے
کیوں کے حاصل ہو مجھ کوں جمعیت زُلف تیری قرار کھوتی ہے
ہر سحر، شوخ کی نِگہ کی شراب مجھ انکھاں کا خُمار کھوتی ہے

کیوں کے ملنا صنم کا ترک کروں ؟ دل بری اختیار کھوتی ہے
اے ولی! اب اُس پری رُو کی مجھ سنے کا غبار کھوتی ہے

(۸)

عاشقاں پر ہمیشہ روشن ہے کہ فنِ عاشقی، عجب فن ہے
دشمنِ دیں کا، دین دشمن ہے راہ زن کا چراغ رہزن ہے
سفرِ عشق کیوں نہ ہو مشکل ؟ غمزۂ چشمِ یار رہزن ہے
مجھ کوں روشن دلاں نے دی ہے خبر کہ سخن کا چراغ روشن ہے
عشق میں شمع رُو کے جلتا ہوں حال میرا سبھوں پہ روشن ہے
اے ولی! تیغِ غم سوں خوف نہیں خاکساری بدن پہ جوشن ہے

(۹)

ہوش کھوتی ہے نازنیں کی ادا سحر ہے سروِ گل جبیں کی ادا
گر ہے مطلوب مجھ کوں نقشِ مراد دیکھ اُس کی بھواں کی چیں کی ادا
ہوش میرا نہیں رہا مجھ میں جب سوں دیکھا ہوں نازنیں کی ادا
موجِ دریا کوں دیکھنے مت جا دیکھ اُس زلفِ عنبریں کی ادا
اے ولی! دل کوں آب کرتی ہے نگہِ چشمِ سرمگیں کی ادا

(۱۰)

طالب نہیں مہر و مشتری کا دیوانہ ہوا جو تجھ پری کا
یو غمزۂ شوخ، ساحری کا اُستاد ہے سحرِ سامری کا
تجھ تل سوں، اے آفتاب طلعت! ممنوں ہوں ذرہ پروری کا
کفارِ فرنگ کوں دیا ہے تجھ زلف نے درس کافری کا
توں سر سوں قدم تلک اے شوخ! گویا ہے قصیدہ انوری کا
خورشید ستی ہوا ہے ہمسر چہرہ، ترے سرمایۂ زری کا

اے غنچہ! نہ کر تو فخر، یو دل مُتکمہ ہے پیا کی بکتری کا
پایا ہے جو کوئی دولتِ فقر مُشتاق نہیں سِکندری کا
پھیکی لگے اُس کوں شانِ دَولت چاکھا جو مزہ قلندری کا
کہتا ہے ولی پُکار یو بات بندہ ہُوں پیا کی دِلبری کا

(۱۱)

اب جُدائی نہ کر، خُدا سوں ڈر! بے وفائی نہ کر، خُدا سوں ڈر!
راست کیشاں سوں، اے کماں ابرُو! کج ادائی نہ کر، خُدا سوں ڈر!
ہے جُدائی میں زِندگی مُشکل آ، جدائی نہ کر، خُدا سوں ڈر!
آرسی دیکھ کر نہ ہو مغرُور خود نمائی نہ کر، خُدا سوں ڈر!
اُس سوں، جو آشنائے درد نہیں آشنائی نہ کر، خُدا سوں ڈر!
اے ولی! غیرِ آستانۂ یار جبّہ سائی نہ کر، خُدا سوں ڈر!

(۱۲)

مُکھ ترا آفتابِ محشر ہے شور اُس کا جہاں میں گھر گھر ہے
رگِ جاں سوں ہُوا ہے خوں جاری یاد تیری پلک کی نشتر ہے
پہنچتا ہے دِلوں کو ہر جاگہ غم ترا روزیِ مُقدّر ہے
تجھ بِن، اے نور بخشِ محفلِ دِل! حالِ مجلس تمام ابتر ہے
سادہ رُو ہیں ہمیشہ باغیرت آب، نِس دِن مُحیطِ گوہر ہے

(۱۳)

یہ مرا رونا، کہ تیری ہے ہنسی؛ آپ بس نئیں، پربسی ہے، پربسی
ہے کُل عالم میں کرم میرے اُپر جزرسی ہے، جزرسی ہے، جزرسی
رات دِن جگ میں رفیقِ بے کساں بے کسی ہے، بے کسی ہے، بے کسی
مست ہونا عشق میں تیرے، صنم! ناکسی ہے، ناکسی ہے، ناکسی

باعثِ رسوائیِ عالم ولی! مفلسی ہے، مفلسی ہے، مفلسی

(۱۴)

اندوہ و غم کی بات، ترے باج بن گئی
آواز میری آہ کی، پھِرتا گگن گئی

تاحشر، اُس کا ہوش میں آنا محال ہے
جِس کی طرف صنم کی نِگاہِ نین گئی

سُرمے کا مُنھ سیاہ کیا اُن نے جگ منیں
جِس کے نین میں پیو کی خاکِ چرن گئی

تنہا سوادِ ہند میں شُہرت نہیں، صنم!
تُجھ زُلفِ مُشک بُو کی خبر تا خُتن گئی

اب لگ ولی! پیا نے دِکھایا نہیں درس
جیوں شمع، اِنتظار میں ساری رین گئی

(۱۵)

کیوں نہ آوے نشۂ غم سوں دِماغِ عاشقی
بادۂ حیرت سوں ہے بریز. ایاغِ عاشقی

اشکِ خوں آلود ہے سامانِ طُغرائے نیاز
مُہرِ فرمانِ وفاداری ہے. داغِ عاشقی

آب سوں دریا کے، ہرگز کام نئیں عُشاق کوں
گریۂ حسرت سوں ہے سرسبز باغِ عاشقی

گر طلب ہے تجھ کوں، رازِ خانۂ دِل ہو عیاں
آہ کی آتش سوں روشن کر چراغِ عاشقی

دردمنداں، باغ میں ہرگز نہ جاویں اے ولی!
گر، نہ دیوے نالۂ بُلبُل سُراغِ عاشقی

(۱۶)

دِل کوں، گر مرتبہ ہو درپن کا
مُفت ہے دیکھنا سِری جن کا

جامہ زیبوں کوں کیوں تجوں؟ کہ مجھے
گھیر رکھتا ہے دُور دامن کا

اے زباں! کر مدد کہ آج صنم
مُنتظِر ہے بیانِ روشن کا

حِکمتِ عشق، بوعلی سوں نہ پوچھ
نئیں وہ قانوں شناس اِس فن کا

آئنہ، تجھ سے ہو کے ہم زانو
غیرت افزا ہُوا ہے گلشن کا

دھن میں تجھ نگہ سوں ہیں بیدار
خوف نئیں مُفلِسوں کوں رہزن کا

ٹک ولی کی طرف نِگاہ کرو
صُبح سوں مُنتظِر ہے درشن کا

(۱۷)

وہ صنم جب سوں بسا دیدۂ حیراں میں آ — آتشِ عشق پڑی عقل کے ساماں میں آ

ناز دیتا نہیں گر رخصتِ گل گشتِ چمن — اے چمن زارِ حیا! دل کے گلستاں میں آ

یاد آتا ہے مجھے جب، وو گلِ باغِ وفا — اشک کرتے ہیں مکاں گوشۂ داماں میں آ

موجِ بے تابیِ دل، اشک میں ہوتی جلوہ نما — جب بسی زلفِ صنم، طبعِ پریشاں میں آ

نالہ و آہ کی تفصیل نہ پوچھو مجھ سوں — دفترِ درد بسا عشق کے داماں میں آ

پنجۂ عشق نے بے تاب کیا جب سوں مجھے — چاکِ دل تب سوں بسا چاکِ گریباں میں آ

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد — طالبِ عشق ہوا، پردۂ انساں میں آ

غم سوں تیرے ہے ترحّم کا محل حالِ ولی — ظلم کوں چھوڑ سجن! شیوۂ احساں میں آ

(۱۸)

وہ نازنیں ادا میں اعجاز ہے سراپا — خوبی میں گل رخاں سوں ممتاز ہے سراپا

اے شوخ! تجھ نین میں دیکھا نگاہ کر کر — عاشق کے مارنے کا انداز ہے سراپا

جگ کے ادا شناساں، ہے جن کی فکر عالی — تجھ قد کوں دیکھ بولے 'یو ناز ہے سراپا'

کیوں ہو سکیں جگت کے دل بر ترے برابر؟ — تو حسن ہور ادا میں اعجاز ہے سراپا

گاہے اے عیسوی دم! یک بات لطف سوں کر — جاں بخش مجھ کوں تیری آواز ہے سراپا

مجھ پر ولی! ہمیشہ دل دار مہرباں ہے — ہر چند حسبِ ظاہر، طنّاز ہے سراپا

(۱۹)

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا — ہے مطالعہ مطلعِ انوار کا

بلبل و پروانہ کرنا دل کے تئیں — کام ہے تجھ چہرۂ گلنار کا

صبح تیرا درس پایا تھا صنم! — شوقِ دل محتاج ہے تکرار کا

ماہ کے سینہ اُپر اے شمع رو! — داغ ہے تجھ حسن کی جھلکار کا

دل کوں دیتا ہے ہمارے پیچ و تاب — پیچ تیرے طرۂ طرار کا

جو سُنا تیرے دہن سوں یک بچن
بھید پایا نسخۂ اسرار کا

چاہتا ہے اِس جہاں میں گر بہشت
جا! تماشا دیکھ اُس رخسار کا

سرکشی، آتش مزاجی ہے سبب
ناصحوں کوں گرمیِ بازار کا

اے ولی! کیوں سُن سکے ناصح کی بات؟
جو دِوانا ہے پری رخسار کا

(۲۰)

پی کے ہوتے، نہ کر توں مہ کی ثنا
مُعتبر نئیں ہے حُسنِ دُور نُما

باعثِ نشۂ دوبالا ہے
حُسنِ صورت کے ساتھ حُسنِ ادا

اے گُلِ باغِ حُسن! مجھ سوں ترے
جلوہ پیرا ہے رنگ و بوئے حیا

ماہِ نَو، تجھ بھواں پہ کر کے نظر
سوئے مغرب چلا ہے رُو بہ قفا

سُرخ رُوئیاں میں سر آمد ہے
تجھ قدم کے اثر سوں رنگِ حنا

نئیں ہے گُل پی کے مُکھ سا عالم میں
قائل اِس بات کی ہے بادِ صبا

اے ولی! مجھ سخن کوں وو بوجھے
جس کوں حق نے دیا ہے فکرِ رسا

(۲۱)

عیاں ہے ہر طرف عالم میں، حُسنِ بے حجاب اُس کا
بغیر از دیدۂ حیراں، نہیں جگ میں نقاب اُس کا

ہُوا ہے مجھ پہ، شمعِ بزمِ یک رنگی سے، یوں روشن
کہ ہر ذرّہ اُپر تاباں ہے دائم آفتاب اُس کا

کرے عُشّاق کوں، جوں صورتِ تصویر، حیرت سوں
اگر پردے سوں وا ہووے جمالِ بے حجاب اُس کا

سجن نے یک نظر دیکھا نگاہِ مست سوں جس کوں
خراباتِ دو عالم میں، سدا ہے وو خراب اُس کا

مرا دل پاک ہے از بس، ولی! زنگِ کدورت سوں
ہُوا جیوں جوہرِ آئینہ، مخفی پیچ و تاب اُس کا

(۲۲)

توں ہے رشکِ ماہِ کنعانی ہنوز
تجھ کوں ہے خوباں میں سُلطانی ہنوز

ہر جھلک دیتی ہے تجھ رخسار کی
آدمی کوں درسِ حیرانی ہنوز

شرم سوں تجھ مُکھ کے، اے دریائے حُسن!
چہرۂ گوہر پہ ہے پانی ہنوز

حلقہ زن ہے تجھ دہن کی یاد میں — خاتمِ دستِ سلیمانی ہنوز
رات کوں دیکھا تھا تیری زلف کوں — دِل میں ہے باقی پریشانی ہنوز
تجھ نمر کوں دیکھ حیراں ہو رہا — مُوقلم لے ہاتھ میں مانی ہنوز
روزِ اوّل سوں چمن میں حُسن کے — نئیں ہُوا پیدا ترا ثانی ہنوز
جان جاتا ہے، ولے آتا نہیں — کیا سبب؟ وہ دِلبرِ جانی ہنوز
اے ولی! اُس گل بدن کے عشق میں — شغل بلبل ہے غزل خوانی ہنوز

(۲۳)

ہر اِک سوں مِل، متواضع ہو، سروری یہ ہے — سنبھال کشتیِ دل کوں، قلندری یہ ہے
نکال خاطرِ فاتر سوں، جامِ جم کا غم — صفا کر آئینۂ دِل، سکندری یہ ہے
خیالِ یار کوں، رکھ اپنے دِل میں محکم کر — کہ عاشقاں کے نزک شیشہ و پری یہ ہے
بساعزیز ہیں تجھ مکھ کے آفتاب پرست — تو جلوہ گر ہو، کہ اب ذرّہ پروری یہ ہے
ٹک اِک نقاب اُٹھاکر، اپس کا مکھ دِکھلا — کہ دِلبراں کے نزک حقِ دِلبری یہ ہے
بسار دِل سوں اپس کے تو یادِ خاقانی — ولی کوں دیکھ، کہ اب رشکِ انوری یہ ہے

(۲۴)

خوبیِ اعجازِ حُسنِ یار گر اِنشا کروں — بے تکلف، صفحۂ کاغذ، یدِ بیضا کروں
پہنچتی نئیں کعبۂ مقصود کوں کشتیِ چشم — فیض سوں انجواں کے، دریا کو مگر پیدا کروں
کیا کہوں تجھ قد کی خوبی؟ سروِ عُریاں کے حضور — خود بخود رُسوا ہے، اُس کوں پھر کے کیا رسوا کروں؟
ہندوئے زُلف پری رُو ہے پریشانی فروش — پیچ دیوے مجھ کوں سودے میں، اگر سودا کروں
تنگ دِل کے دِل پہ ہووے نقش، جیوں نقشِ نگیں — آہ کا لے کر قلم، جب درد کو اِنشا کروں
آرزو دِل میں یہی ہے، وقت مرنے کے ولی! — سرو قد کوں دیکھ، سیرِ عالمِ بالا کروں

سودا - مرزا محمد رفیع

ولادت ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۲ء
وفات ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۱ء

چہرے پہ نہ یہ نقاب دیکھا پردے میں تھا آفتاب دیکھا
کچھ میں ہی نہیں ہوں، ایک عالم اُس کے لیے یاں خراب دیکھا
بے جُرم و گناہ، قتلِ عاشق مذہب میں ترے ثواب دیکھا
جس چشم نے مجھ طرف نظر کی اُس چشم کو میں پُر آب دیکھا
بھولا ہے وہ دل سے لطف اُس کے سودا نے، یہ جب عتاب دیکھا

(۲)

جب نظر اُس کی آن پڑتی ہے زندگی تب دھیان پڑتی ہے
جھیل لیتے ہیں عاشق، اے فرہاد! جس کے سر، جیسی آن پڑتی ہے
بات اُس دل کے درد کی یارو! گفتگو میں ندان پڑتی ہے
ایک کے منہ سے جس گھڑی نکلی پھر تو سو کی زبان پڑتی ہے
منزلت شعر کی ترے سودا! یوں بہ وہم و گمان پڑتی ہے
نہیں عیسیٰ تو، پر سخن سے ترے تنِ بے جاں میں جان پڑتی ہے

(۳)

دل دار اُس کو، خواہ دلِ آزار، کچھ کہو سنتا نہیں کسو کی مرا یار، کچھ کہو!
غمزہ، ادا، نگاہ، تبسم ہے دل کا مول تم بھی اگر ہو اُس کے خریدار، کچھ کہو!
ہر آن آ مجھی کو ستاتے ہو، ناصحو! سمجھا کے تم اُسے بھی تو یک بار، کچھ کہو!
عالم کی گفتگو سے تو آتی ہے بوئے خوں بندہ ہے اک نظر کا گنہ گار، کچھ کہو!

(۴)

گل پھینکے ہے عالم کی طرف، بلکہ ثمر بھی اے خانہ برانداز چمن! کچھ تو ادھر بھی

کیا ضد ہے مرے ساتھ، خدا جانے ہو گر نہ
کافی ہے تسلی کو مری ایک نظر بھی

اے ابر! قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے
تجھ چشم سے ٹپکا ہے کبھو، لختِ جگر بھی؟

کس ہستیِ موہوم پہ، نازاں ہے تو اے یار!
کچھ اپنے شب و روز کی، ہے تجھ کو خبر بھی؟

تنہا، ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریبانِ سحر بھی

سودا! تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آتی ہے سحر ہونے کو، ٹک تو کہیں مر بھی

(۵)

بہار بے سپرِ جام و یار گزرے ہے
نسیم تیر سی چھاتی کے پار گزرے ہے

گزر مرا، ترے کوچے میں گو نہیں، نہ سہی
مرے خیال میں تو لاکھ بار گزرے ہے

کہے ہے آج ترے در پہ اضطرابِ نسیم
کہ اس جہاں سے کوئی خاکسار گزرے ہے

میں وہ نہیں، کہ کوئی مجھ سے مل کے ہو بدنام
نہ جانے! کیا تری خاطر میں، یار گزرے ہے!

مجھے تو دیکھ کے جوش و خروش سودا کا
اسی ہی سوچ میں فصلِ بہار گزرے ہے

یہ آدمی ہے کہ سر مارتا پھرے ہے بہ سنگ
کہ بادِ تند سوئے کوہسار گزرے ہے

(۶)

باتیں کدھر گئیں وہ تری بھولی بھالیاں؟
دل لے کے بولتا ہے، جواب تو یہ بولیاں

ہر بات ہے لطیفہ و ہر یک سخن ہے رمز
ہر آن ہے کنایہ و ہر دم ٹھٹھولیاں

حیرت نے، اس کو بند نہ کرنے دیا پھر کبھو
آنکھیں، جب آرسی نے، ترے منہ پہ کھولیاں

کس نے کیا خرام چمن میں؟ کہ اے صبا!
لاتے ہیں بوئے ناز سے بھر بھر کے جھولیاں

سودا کے دل سے صاف نہ رہتی تھی زلفِ یار
شانے نے پیچ پڑ کے، گرہ اس کی کھولیاں

(۷)

بدلا ترے ستم کا، کوئی تجھ سے کیا کرے؟
اپنا ہی تو فریفتہ ہووے، خدا کرے

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

گر ہو شراب و خلوت و محبوبِ خوب رو
زاہد! تجھے قسم ہے، جو تو ہو تو کیا کرے؟

تعلیمِ گریہ دوں، اگر ابرِ بہار کو — جز لختِ دِل، صدف میں نہ گوہر بندھا کرے
تنہا، نہ روزِ ہجر ہی، سودا پہ ہے ستم — پروانہ سال، وِصال میں ہر شب جلا کرے

(۸)

جفا و مہر، جو خاطر میں اب تری آوے — وہی ہے خوب مرے حق میں، جو تجھے بھاوے
سمجھ کے کیجیو پیارے! گلی میں اپنی خرام — مبادا! پانو تلے دِل کسی کا آ جاوے
درختِ خشک ہوں اِس باغ میں، خدا نہ کرے — کہ باغباں مرے احوال سے خبر پاوے
کچھ اِن دِنوں، تری نظروں سے گر چلا ہے دِل — جو دستگیریِ مژگاں ہو تو سنبھل جاوے
بدن کو شمع سے، کون اُس کے دے سکے تشبیہ — جمال کیا ہے کسی کی؟ زبان جل جاوے

(۹)

نسیم بھی ترے کوچے میں، اور صبا بھی ہے — ہماری خاک سے دیکھو، تو کچھ رہا بھی ہے؟
ترا غرور، مرا عجز، تا کجا ظالم؟ — ہر ایک بات کی، آخر کچھ اِنتہا بھی ہے؟
جلے ہے شمع سے پروانہ، اور میں تجھ سے — کہیں ہے مہر بھی جگ میں؟ کہیں وفا بھی ہے؟
ستم روا ہے اسیروں پہ اِس قدر صیاد؟ — چمن چمن کہیں بلبل کی اِک نوا بھی ہے؟
سمجھ کے رکھیو قدم، خارِ دشت پر، مجنوں! — کہ اِس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

(۱۰)

ڈرتے ڈرتے، جو ترے کوچے میں آ جاتا ہوں — صیدِ خائف کی طرح، رو بہ قضا جاتا ہوں
کیوں مجھے گھر سے نکالے ہے؟ کہ اب تجھ کو دیکھ — آپ سے، اب تو مری جان! چلا جاتا ہوں
نہ تلطف، نہ محبت، نہ مروّت، نہ وفا — سادگی دیکھ، کہ اِس پر بھی لگا جاتا ہوں
سوچوں ہوں اپنے تئیں، جوں سخنِ رفتہ زیاد — گاہ بے گاہ، اگر آپ میں آ جاتا ہوں
صفحۂ ہستی پہ، اِک حرفِ غلط ہے سودا — جب مجھے دیکھنے بیٹھو، تو اُٹھا جاتا ہوں

(۱۱)

تجھ بِن یہ چمن، ہر خس و ہر خار، پریشاں — حیران ہے نرگس، گُل و گُل زار پریشاں

گہ کفر کا مائل ہے یہ دِل، گہ سُوئے اِسلام — ہے در طلبِ سُبحہ و زُنّار پریشاں
میں حالِ دِل اِس واسطے کرتا نہیں اِظہار — تا غم نہ کرے، خاطرِ غم خوار، پریشاں
اختر نہ سمجھیو، یہ مِری آہِ شرر بار — ہوتی ہے فلک پر بہ شبِ تار پریشاں
دی ناز نے رُخصت نہ نگہ ایدھر جو وہ دیکھے — اِس پر کہ سدا ہے، نظرِ یار پریشاں
ہوش اور حواس اپنے، عمل سے ترے سودا! — کرتا ہے نویسندۂ کردار پریشاں

(۱۲)

صورت میں تو کہتا نہیں، ایسا کوئی کب ہے؟ — اِک درج ہے کہ وہ قہر ہے، آفت ہے، غضب ہے
کیا چیز ہے وہ؟ دِل جِسے کہتے ہیں الٰہی! — اِک قطرۂ خوں سینے میں آفات طلب ہے
اِک طرز ہو لُٹ جانے کی دِل کے، تو کہوں میں — ہے جو حرکت، جان کی غارت کا سبب ہے
تجھ بن مِری نظروں میں یہ تاریک ہے عالم — ہر روز مِری آنکھوں میں محاون کی سی شب ہے
کہتے ہیں جِسے عشق، سو وہ چیز ہے سودا! — جوں ذاتِ خُدا جس کے حسب ہے نہ نسب ہے

(۱۳)

قاصدِ اشک آکے خبر کر گیا — قتل کوئی دِل کا نگر کر گیا
وہمِ غلط کار نے دِل خوش کیا — کِس پہ نہ جانے وہ نظر کر گیا؟
فائدہ اب کیا کرے تریاقِ وصل؟ — زہرِ غمِ ہجر اثر کر گیا
دیکھیے: واماندگی اب کیا دکھائے؟ — قافلہ یاروں کا سفر کر گیا
فیض تیرے وصفِ بُنا گوش کا — حرف کو سودا کے، گہر کر گیا

(۱۴)

جو گُزری مجھ پہ مت اُس سے کہو، ہُوا سو ہُوا — بلاکشانِ محبت پہ، جو ہُوا سو ہُوا
پہنچ چُکا ہے سرِ زخمِ دِل تلک یارو! — کوئی سیو، کوئی مرہم رکھو! ہُوا سو ہُوا
کہے ہے سُن کے مِری سرگزشت وہ بے رحم — یہ کون ذکر ہے، جانے بھی دو! ہُوا سو ہُوا
یہ کون حال ہے؟ احوالِ دِل پہ، اے آنکھو! — نہ پھُوٹ پھُوٹ کے اتنا بہو! ہُوا سو ہُوا
دیا اُسے دِل و دیں، اب یہ جان ہے سودا! — پھر آگے دیکھیے جو ہو سو ہو، ہُوا سو ہُوا

دردؔ - خواجہ میر

ولادت ۱۱۳۳ھ / ۲۱-۱۷۲۰ء
وفات جمعہ ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ / ۷ جنوری ۱۷۸۵ء

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے؟ — میرا ہی دل ہے وہ، کہ جہاں تو سما سکے
میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے — نقشِ قدم کی طرح نہ کوئی اُٹھا سکے
قاصد! نہیں یہ کام ترا، اپنی راہ لے — اُس کا پیام دِل کے سوا کون لا سکے؟
غافل! خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار — اپنے تئیں بھلا دے، اگر تو بھلا سکے
یارب! یہ کیا طلسم ہے؟ اِدراک و فہم یاں — دَوڑے ہزار، آپ سے باہر نہ جا سکے
اِطفائے رازِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے — یہ آگ وہ نہیں، جسے پانی بجھا سکے
مستِ شرابِ عشق وہ بے خودی، جس کو حشر — اے دردؔ! چاہے لائے بخود، پھر نہ لا سکے

(۲)

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک! جستجو کریں؟ — دِل ہی نہیں رہا ہے، جو کچھ آرزو کریں
مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں — گر آئنہ کے سامنے ہم آ کے ہُو کریں
تر دامنی پہ شیخ! ہماری نہ جائیو! — دامن نچوڑ دیں، تو فرشتے وضو کریں
سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم — پر یہ کہاں مجال! جو کچھ گفتگو کریں
ہر چند آئنہ ہوں، پر اِتنا ہوں ناقبول — مُنہ پھیرلے وہ جس کے مجھے روبرو کریں
نے گل کو ہے ثبات، نہ ہم کو ہے اعتبار — کس بات پر چمن! ہوسِ رنگ و بو کریں؟
ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر — اے دردؔ! آ کے بیعتِ دستِ سبو کریں

(۳)

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا — کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
اُس نے قصداً بھی میرے نالے کو — نہ سُنا ہوگا، گر سُنا ہوگا
دیکھیے غم سے اب کے جی میرا — نہ بچے گا، بچے گا، کیا ہوگا؟
دِل زمانہ کے ہاتھ سے سالم — کوئی ہوگا؟ کہ رہ گیا ہوگا

حالِ مجھ غم زدے کا، جس تس نے — جب سُنا ہوگا، رو دیا ہوگا
دِل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں — کہیں غنچہ کوئی کِھلا ہوگا
قتل سے میرے وہ جو باز رہا — کِسی بد خواہ نے کہا ہوگا
دِل بھی، اے درد! قطرۂ خوں تھا — آنسوؤں میں کہیں گِرا ہوگا

(۴)

سینہ و دِل حسرتوں سے چھا گیا — بس ہجومِ یاس! جی گھبرا گیا
تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جُز جفا — پر، وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا؟
کُھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مِری — جی میں یہ کِس کا تصوّر آ گیا؟
مَیں تو کچھ ظاہر نہ کی تھی دِل کی بات — وہ مِری نظروں کے ڈھب سے پا گیا
پی گئی کِتنوں کا لوہو تیری یاد؟ — غم تِرا کِتنے کلیجے کھا گیا؟

(۵)

تُہمتِ چند اپنے ذِمّے دھر چلے — جس لیے ہم آئے تھے، سو کر چلے
زندگی ہے، یا کوئی طوفان ہے؟ — ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے
کیا ہمیں کام اِن گُلوں سے، اے صبا! — ایک دم آئے اِدھر، اُودھر چلے
شمع کی مانند ہم اِس بزم میں — چشمِ تر آئے تھے، دامن تر چلے
ڈھونڈتے ہیں آپ سے اُس کو پرے — شیخ صاحب چھوڑ گھر، باہر چلے
ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے، ساغر چلے
درد! کچھ معلوم ہے؟ یہ لوگ سب — کِس طرف سے آئے تھے، کیدھر چلے؟

(۶)

قسم ہے حضرتِ دِل ہی کے آستانے کی — ہوس سو جی میں جو دیر و حرم میں جانے کی
طریق اپنے پہ اِک دورِ جام چلتا ہے — دگرنہ جو ہے، سو گردش میں ہے زمانے کی
نظر نہ کیجو تو! میرے دِل کے خطروں پر — نہ جی میں لائیو کچھ نہ بات کیا دِوانے کی

جفا و جور اُٹھانے پڑے زمانے کے — ہوس تھی جی میں، کسی ناز کے اُٹھانے کی
طریقِ ذکر تو ہے دردؔ! یادِ عالم کو — طرح بتا، تو مجھ اپنے تئیں بھلانے کی

(۷)

اُس نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں — پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں
آ جائے ایسے جینے سے اپنا تو جی بہ تنگ — جیتا رہے گا کب تلک، اے خضر! مر کہیں
پھرتی رہی تڑپتی ہی عالم میں جا بجا — دیکھا نہ میری آہ نے، روئے اثر کہیں
یوں تو نظر پڑیں ہیں تنِ افگار اور بھی — دل ریش کوئی آپ سا دیکھا نہ پر کہیں
ظالم! جفا جو چاہے سو کر مجھ پہ تو، و لے — پچھتاوے پھر تو آپ ہی، ایسا نہ کر کہیں

(۸)

مژگانِ تر ہوں، یا رگِ تاکِ بریدہ ہوں — جو کچھ کہ ہوں سو ہوں، غرض آفت رسیدہ ہوں
ہر شام، مثلِ شام ہوں میں تیرہ روزگار — ہر صبح، مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں
چاہے ہے یہ مری تپشِ دل کہ بعدِ مرگ — کنجِ مزار میں بھی نہ میں آرمیدہ ہوں
کرتی ہے موجِ گل! تو مرے ساتھ اختلاط — پر آہ! میں تو موجِ نسیمِ وزیدہ ہوں
اے دردؔ! جا چکا ہے مرا کام ضبط سے — میں غم زدہ تو قطرۂ اشکِ چکیدہ ہوں

(۹)

آنکھوں کی راہ ہر دم اب خوں ہی رواں ہے — جو کچھ ہے میرے دل میں، منہ پر مرے عیاں ہے
غنچہ ہے دل گرفتہ، گل کا ہے چاک سینہ — گلشن میں ہیں تو، پر کچھ آسودگی کہاں ہے؟
آہوں کی کشمکش میں کہیں دیکھیو نہ ٹوٹے — تارِ نفس سے اے دل! وابستہ میری جاں ہے
گمنام اب جہاں میں، مجھ سا نہیں ہے کوئی — عنقا کا نام تو ہے، ہر چند بے نشاں ہے
مت موت کی تمنا اے دردؔ! ہر گھڑی کر — دنیا کو دیکھ تو بھی، تو تو ابھی جواں ہے

(۱۰)

گلیمِ بختِ سیہ سایہ دار رکھتے ہیں — یہی بساط میں ہم خاکسار رکھتے ہیں

ہمیشہ فتح نصیبی ہمیں نصیب رہی — جو کچھ کہ اُپجے ہے جی میں، سو مار رکھتے ہیں
بلا ہے نشۂ دُنیا، کہ تا قیامت آہ! — سب اہلِ قبر اُسی کا خُمار رکھتے ہیں
ہمارے پاس ہے کیا؟ جو کریں فدا تجھ پر — مگر یہ زندگیِ مُستعار رکھتے ہیں
وہ زندگی کی طرح ایک دم نہیں رہتا — اگرچہ دردؔ! اُسے ہم ہزار رکھتے ہیں

(۱۱)

یوں ہی ٹھہری، کہ ابھی جائیے گا — بات جو ہوگی، سو فرمائیے گا
مَیں جو پُوچھا، کبھو آؤ گے؟ کہا! — جی میں آجائے گی، تو آئیے گا
مَیں خُدا جانے! یہ کیا دیکھا ہُوں؟ — آپ کچھ جی میں نہ بھرمائیے گا
میرے ہونے سے عبث رُکتے ہو! — پھر اکیلے بھی تو گھبرائیے گا
کہیں ہم کو بھی، بھلا لوگوں میں — چلتے پھرتے نظر آجائیے گا
دردؔ! ہم اُس کو تو سمجھائیں گے، پر — اپنے تئیں آپ بھی سمجھائیے گا

(۱۲)

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا؟ — پر اُسے آہ! کچھ اثر نہ کیا
سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما — اِس طرف کو کبھو گزر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا — کچھ خُدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم — نہ کیا تو نے، تو نے پر نہ کیا
کون سا دل ہے وہ؟ کہ جس میں آہ! — خانہ آباد! تو نے گھر نہ کیا
تجھ سے ظالم کے سامنے آیا — جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا
سب کے جوہر نظر میں آئے دردؔ! — بے ہُنر! تو نے کچھ ہُنر نہ کیا

(۱۳)

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا — بس ہجومِ یاس، جی گھبرا گیا
تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جُز جفا — پر، وہ کیا کچھ ہے؟ کہ جی کو بھا گیا

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری — جی میں یہ کس کا تصوّر آ گیا ؟
میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات — پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا
پی گئی کتنوں کا لہو تیری یاد — غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا ؟
مٹ گئی تھی اس کے جی سے تو جھجک — درد! کچھ بک بک کے تو چونکا گیا

(۱۴)

مجھے در سے اپنے تو ٹالے ہے، یہ بتا مجھے تو کہاں نہیں ؟
کوئی اور بھی ہے ترے سوا؟ تو اگر نہیں تو جہاں نہیں
پڑی جس طرف کو نگاہ یاں، نظر آ گیا ہے خدا ہی واں
یہ ہیں گو کہ آنکھوں کی پتلیاں، مرے دل میں جائے بتاں نہیں
مرے دل کے شیشے کو بے وفا! تو نے ٹکڑے ٹکڑے ہی کر دیا
مرے پاس تو وہی ایک تھا، یہ دکانِ شیشہ گراں نہیں
کوئی مجھ سے کیوں کہ یہ مدعا، کہ پہیلی سا ہے یہ ماجرا
کہا میں: مجھے نہیں چاہ کیا؟ لگا مجھ سے کہنے کہ ہاں نہیں
مجھے درد! کیوں کہ سناؤں میں؟ نہ خدا کسی کو دکھاوے یہ
جو کچھ اپنے جی پہ گزرتی ہے، کہوں کیا کہ اس کا بیاں نہیں

(۱۵)

ہستی ہے سفر، عدم وطن ہے — دل خلوت و چشم انجمن ہے
ہر چند کہ تنگ دل ہے شیریں — لیکن فرہاد کوہ کن ہے
دیکھا! یہ شورشِ من و ما — ہنگامۂ وصلِ جان و تن ہے
مت جا! تر و تازگی پہ اس کی — عالم، تو خیال کا چمن ہے

میرؔ - میر محمد تقی

ولادت ۱۱۳۵ھ/ ۱۷۲۳ء
وفات ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ/ ۲۱ ستمبر ۱۸۱۰ء

راہِ دُورِ عشق میں روتا ہے کیا؟ — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!
قافلے میں صبح کے اِک شور ہے — یعنی، غافل ہم چلے، سوتا ہے کیا؟
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں — تخمِ خواہش، دل میں تو بوتا ہے کیا؟
یہ نشانِ عشق ہیں، جاتے نہیں — داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا؟
غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز — میرؔ! اِس کو رائگاں کھوتا ہے کیا؟

(۲)

ہستی اپنی حباب کی سی ہے — یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے؟ — پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے
بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں — حالت اب اضطراب کی سی ہے
مَیں جو بولا، کہا کہ یہ آواز — اُسی خانہ خراب کی سی ہے
میرؔ! اُن نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے

(۳)

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا؟ — لہُو آتا ہے، جب نہیں آتا
ہوش جاتا نہیں رہا؛ لیکن — جب وہ آتا ہے، تب نہیں آتا
صبر تھا ایک مونسِ ہجراں — سو، وہ مدّت سے اب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش — گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
جی میں کیا کیا ہے؛ اپنے اے ہم دم! — پر، سخن تا بہ لب نہیں آتا
دُور بیٹھا غبارِ میرؔ اُس سے — عشق بِن یہ ادب نہیں آتا

(۴)

کوفت سے، جان لب پہ آئی ہے — ہم نے کیا چوٹ! دل پہ کھائی ہے

لکھتے رقعہ، لکھے گئے دفتر — شوق نے، بات کیا بڑھائی ہے؟
دیدنی ہے شکستگی دل کی — کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے!
دل سے نزدیک اور اِتنا دور — کس سے، اُس کو کچھ آشنائی ہے؟
بے ستوں کیا ہے؟ کوہ کن کیسا؟ — عشق کی زور آزمائی ہے
یاں ہوئے خاک سے برابر ہم — واں وہی نازِ خود نمائی ہے
مرگِ مجنوں سے عقل گُم ہے میر! — کیا دِوانے نے موت پائی ہے؟

(۵)

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دِل — سارے عالم میں مَیں دِکھا لایا
دِل، کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش — ایک عالم کے سر بلا لایا
سب پہ، جس بار نے گرانی کی — اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا
دِل، مجھے اُس گلی میں لے جاکر — اور بھی خاک میں مِلا لایا
اب تو جاتے ہیں مے کدے سے، میر! — پھر ملیں گے، اگر خدا لایا

(۶)

کیا میں بھی پریشانیِ خاطر کے قریں تھا — آنکھیں تو کہیں تھیں، دلِ غم دیدہ کہیں تھا
اب کوفت سے ہجراں کے، جہاں تن پہ رکھا ہاتھ — جو درد و الم تھا، سو کہے تو کہ وہیں تھا
جانا نہیں کچھ، جز غزل، آکر کے جہاں میں — کل میرے تصرف میں یہی قطعہ زمیں تھا
نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے اُنھوں کا — جن لوگوں کے کل مُلک یہ سب زیرِ نگیں تھا
مسجد میں امام آج ہوا آکے وہاں سے — کل تک تو یہی میر، خرابات نشیں تھا

(۷)

غم رہا، جب تک کہ دم میں دم رہا — دِل کے جانے کا نہایت غم رہا
دِل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک — قطرۂ خوں تھا، مژہ پر جم رہا
جامۂ احرام زاہد پر نہ جا — تھا حرم میں، لیک نامحرم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی ایک مدّت تک وہ کاغذ نم رہا
صبحِ پیری، شام ہونے آئی میرؔ! تو نہ چیتا، یاں بہت دن کم رہا

(۸)

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا کل اُس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے، گیا کون سلامت؟ اسباب لُٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی اب سنگ مداوا ہے اِس آشفتہ سری کا
اپنی تو، جہاں آنکھ لڑی، پھر وہیں دیکھو آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا
لے سانس بھی آہستہ، کہ نازک ہے بہت کام آفاق کی اِس کارگہِ شیشہ گری کا

(۹)

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں
عشق میں ایذائیں سب سے پائیاں رہ گئے آنسو، تو آنکھیں آئیاں
اُس مژہ برہم زدہ نے بارہا عاشقوں میں برچھیاں چلوائیاں
ایک نے صورت نہ پکڑی پیشِ یار دل میں شکلیں سیکڑوں ٹھہرائیاں
شوقِ قامت میں ترے، اے نونہال! گُل کی شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں
پاس مجھ کو بھی نہیں ہے، میرؔ! اب دُور پہنچی ہیں مری رسوائیاں

(۱۰)

کیا کروں شرح خستہ جانی کی؛ مَیں نے مر مر کے زندگانی کی
حالِ بد گفتنی نہیں میرا تم نے پوچھا، تو مہربانی کی
سب کو جانا ہے یوں تو، پر اے صبر! آتی ہے اِک تری جوانی کی
تشنہ لب مر گئے ترے عاشق نہ ملی ایک بوند پانی کی
جس سے کھوئی تھی نیند میرؔ نے کل
ابتدا پھر وہی کہانی کی

(۱۱)

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں؛ اُس سے آنکھیں لگیں، تو خواب کہاں؛
بے کلی دِل ہی کی تماشا ہے برق میں ایسے اِضطراب کہاں؛
ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں؛
گِریۂ شب سے سُرخ ہیں آنکھیں مجھ بلا نوش کو شراب کہاں؛
داغ رہنا دِل و جگر کا دیکھ جلتے ہیں اِس طرح کباب کہاں؛
محو ہیں اُس کِتابی چہرے کے عاشقوں کو سرِ کِتاب کہاں؛
عشق کا گھر ہے میرؔ سے آباد ایسے پھر خانماں خراب کہاں؛

(۱۲)

کیا کہے حال کہیں، دِل زدہ جاکر اپنا دِل نہ اپنا ہے محبّت میں، نہ دِل بر اپنا
دُوریِ یار میں، ہے حالِ دِل ابتر اپنا ہم کو سَو کوس سے آتا ہے نظر گھر اپنا
کِس طرح حرف ہو ناصح کا موثّر ہم میں سختیاں کھینچتے ہی دِل ہُوا پتھّر اپنا
کیسی رُسوائی ہُوئی عشق میں کیا نقل کریں؛ شہر و قصبات میں مذکور ہے گھر گھر اپنا
دِل بہت کھینچتی ہے یار کے کُوچے کی زمیں لوہو اُس خاک پہ گرنا ہے مقرّر اپنا

(۱۳)

چلے ہے باغ کی صبا کیا خاک؛ دِل جلا کوئی ہو گیا کیا خاک؛
ہم گرے اُس کے در ہی پر مر کر اور کوئی کرے وفا کیا خاک؛
خاک ہی میں مِلائے رکھتے ہو ہو کوئی تم سے آشنا کیا خاک؛
سب مُوئے اِبتدائے عشق ہی میں ہووے معلوم اِنتہا کیا خاک؛
خاک پر ہے سدا جبینِ نیاز اور کوئی ہو جُبّہ سا کیا خاک؛

تُربتِ میرؔ پر چلے تم دیر
اِتنی مدّت میں واں رہا کیا خاک؛

(۱۴)

جفائیں دیکھ لیاں، بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہُوا کہ تری سب بُرائیاں دیکھیں

ترے وصال کے ہم شوق میں ہو آوارہ
عزیز، دوست، سبھوں کی جُدائیاں دیکھیں

ہمیشہ مائلِ آئینہ ہی تجھے پایا
جو دیکھیں ہم نے، یہی خُود نمائیاں دیکھیں

شہاں، کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

بنی نہ اپنی تو اُس جنگ جُو سے ہرگز میر!
لڑائیں جب سے ہم آنکھیں، لڑائیاں دیکھیں

(۱۵)

بے خبر دِل بُتوں کا کیا معلوم؟
نکلے پردے سے کیا؟ خُدا معلوم!

یہی جانا، کہ کچھ نہ جانا، ہائے!
سو بھی اِک عمر میں ہُوا معلوم

علم سب کو یہ ہے، کہ سب تو ہے
پھر ہے اللہ! کیسا نا معلوم

گرچہ تو ہی ہے سب جگہ، لیکن
ہم کو تیری نہیں ہے جا معلوم

عشق، جانا تھا مار رکھّے گا
ابتدا میں تھی اِنتہا معلوم

عشق ہے اے طبیب! جی کا روگ
لُطف کر، ہے جو کچھ دوا معلوم

دِل بجا ہو تو میر کچھ کھاوے
کُڑھنے پچنے میں اِشتہا معلوم

(۱۶)

آنکھوں میں جی مرا ہے، اِدھر یار! دیکھنا!
عاشق کا اپنے، آخری دیدار دیکھنا!

کیسا چمن؟ کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے
چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا

گر زمزمہ یہی ہے کوئی دِن، تو ہم صفیر!
اِس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا

بُلبُل! ہمارے گُل پہ، نہ گستاخ کر نظر!
ہوجائے گا گلے کا کہیں ہار دیکھنا

اُس خوش نگہ کے عشق سے پرہیز کیجو میر!
جاتا ہے لے کے جی ہی یہ آزار، دیکھنا

(۱۷)

کچھ نہ پوچھو، بہک رہے ہیں ہم
عشق کی مے سے، چھک رہے ہیں ہم

سوکھ غم سے، ہوئے ہیں کانٹا سے
پر دلوں میں کھٹک رہے ہیں ہم

وقفۂ مرگ اب ضروری ہے
عمر طے کرتے تھک رہے ہیں ہم

کون پہنچے ہے بات کی تہ کو؟
ایک مدت سے بک رہے ہیں ہم

نقشِ پا سی، رہی ہیں کھل آنکھیں
کس کی یوں راہ تک رہے ہیں ہم؟

دست دے گی کب؟ اُس کی پابوسی
دیر سے سر پٹک رہے ہیں ہم

میرؔ! شاید لیں اُس کی زُلف سے کام
برسوں سے تو لٹک رہے ہیں ہم

(۱۸)

کئی دن سلوک وداع کا، مرے درپئے دلِ زار تھا
کبھو درد تھا، کبھو داغ تھا، کبھو زخم تھا، کبھو وار تھا

دلِ خستہ جو لوہو ہو گیا، تو بھلا ہوا، کہ کہاں تلک؟
کبھو سوزِ سینہ سے داغ تھا، کبھو درد و غم سے فگار تھا

دلِ مضطرب سے گزر گئی شبِ وصل اپنی ہی فکر میں
نہ دماغ تھا، نہ فراغ تھا، نہ شکیب تھا، نہ قرار تھا

یہ تمھاری اِن دِنوں دوستاں! مژہ جس کے غم میں ہے خوں چکاں
وہی آفتِ دلِ عاشقاں، کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

کبھو جائے گی جو اُدھر صبا! تو یہ کہیو اُس سے کہ بے وفا!
مگر ایک میرِ شکستہ پا، ترے باغِ تازہ میں خار تھا؟

(۱۹)

جور کیا کیا؟ جفائیں کیا کیا ہیں؟
عاشقی میں، بلائیں کیا کیا ہیں؟

خوب رو ہی نہیں فقط وہ شوخ
حُسن کیا کیا؟ ادائیں کیا کیا ہیں؟

فکرِ تعمیرِ دِل کسو کو نہیں
ایسی ویسی بنائیں کیا کیا ہیں؟

گہ نسیم و صبا ہے، گاہ سموم
اِس چمن میں ہوائیں کیا کیا ہیں؟

شور ہے ترکِ شیخ کا، لیکن چُپکے چُپکے دعائیں کیا کیا ہیں؟
منظرِ دیدہ، قصرِ دل اے میر! شہرِ تن میں بھی جائیں کیا کیا ہیں؟

(۲۰)

ہم ہیں مجروح، ماجرا ہے یہ وہ نمک چھڑکے ہے، مزا ہے یہ
آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم اب جو ہیں خاک، انتہا ہے یہ
شکر اُس کی جفا کا ہو نہ سکا دل سے اپنے، ہمیں گلا ہے یہ
بودِ آدم، نمودِ شبنم ہے ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ
ہے رے بے گانگی! کبھو اُن نے نہ کہا یہ، کہ آشنا ہے یہ
میر کو کیوں نہ مغتنم جانے؟ اگلے لوگوں میں اِک رہا ہے یہ

(۲۱)

جنوں نے تماشا بنایا ہمیں رہا دیکھ اپنا، پرایا ہمیں
سدا ہم تو کھوئے گئے سے رہے کبھو آپ میں، تم نے پایا ہمیں؟
یہی تا دمِ مرگ بے تاب تھے نہ اُس بِن تنک صبر آیا ہمیں
شب آنکھوں سے دریا سا بہتا رہا اِنھیں نے کنارے لگایا ہمیں
لگی سر سے جوں شمع، پا تک گئی سب اِس داغ نے، آہ! کھایا ہمیں
جلیں پیش و پس، جیسے شمع و پتنگ جلا وہ بھی، جن نے جلایا ہمیں
رہا تو، تو اکثر الم ناک میر! ترا طور کچھ خوش نہ آیا ہمیں

(۲۲)

ملتفت ہوتا نہیں ہے گاہ تو کس قدر مغرور ہے؟ اللہ! تو
مجھ سے رکتے؟ جان سے جاتے رہے کس کی میت کے گیا ہمراہ تو؟
بے خودی رہتی ہے اب اکثر مجھے حال سے میرے نہیں آگاہ تو
فرش ہیں آنکھیں ہی تیری راہ میں آہ! ٹک تو دیکھ کر چل راہ تو

میرؔ! تو تو عاشقی میں کھپ گیا مت کسی کو چند روز اب چاہ تو!

(۲۳)

عشق میں، نے خوف و خطر چاہیے جان کے دینے کو، جگر چاہیے

حال یہ پہنچا ہے کہ اب ضعف سے اُٹھتے پلک ایک پہر چاہیے

کم ہیں شناسائے زرِ داغِ دِل اِس کے پرکھنے کو نظر چاہیے

عشق کے آثار ہیں اے بوالہوس! داغ بہ دِل، دست بہ سر چاہیے

شرط سلیقہ ہے ہر اِک امر میں عیب بھی کرنے کو ہُنر چاہیے

(۲۴)

بوٗ، نقش و نگار سا ہے کچھ صوٗرت، اِک اعتبار سا ہے کچھ

یہ جو مہلت، جسے کہیں ہیں عُمر دیکھو! تو اِنتظار سا ہے کچھ

مُنتظِر اُس کی گردِ راہ کے تھے آنکھوں میں سو غُبار سا ہے کچھ

ضُعفِ پیری میں زندگانی بھی دوش پر اپنے، بار سا ہے کچھ

اُس کی برہم زنیِ مژگاں سے دِل میں اب خار خار سا ہے کچھ

جیسے عنقا، کہاں ہیں ہم؟ اے میرؔ! شہروں میں اِشتہار سا ہے کچھ

(۲۵)

جب نام ترا لیجے، تب چشم بھر آوے اِس زندگی کرنے کو، کہاں سے جگر آوے!

واعظ نہیں کیفیتِ مے خانہ سے آگاہ یک جُرعہ بدل، ورنہ یہ مندیل دھر آوے

صنّاع ہیں سب خوار، ازاں جملہ ہوں میں بھی ہے عیب بڑا اُس میں، جسے کچھ ہُنر آوے

اے وہ! کہ تو بیٹھا ہے سرِ راہ، یہ زنہار ق کہیو، جو کبھو میرؔ بلاکش اِدھر آوے

مت دشتِ محبّت میں قدم رکھ! کہ خضر کو ہر گام پہ اِس رہ میں، سفر سے حذر آوے

(۲۶)

میرؔ دریا ہے، سُنے شعر زبانی اُس کی اللہ، اللہ رے! طبیعت کی روانی اُس کی

مینھ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے — اُسی انداز سے تھی، اشک فشانی اُس کی
بات کی طرز کو دیکھو، تو کوئی جادو تھا — پر ملی خاک میں، کیا سحر بیانی اُس کی
سرگزشت اپنی، کس اندوہ سے شب کہتا تھا؟ — سو گئے تم، نہ سُنی آہ! کہانی اُس کی
مرثیے دل کے، کئی کہہ کے دِیے لوگوں کو — شہرِ دلّی میں ہے سب پاس نِشانی اُس کی
آبلے کی سی طرح، ٹھیس لگی، پھوٹ بہی — درد مندی میں گئی ساری جوانی اُس کی
اب گئے اُس کے، جُز افسوس نہیں کچھ حاصل — حَیف، صد حَیف! کہ کچھ قدر نہ جانی اُس کی

(۲۷)

وہ رابطہ نہیں، وہ محبّت نہیں رہی — اُس بے وفا کو ہم سے کچھ اُلفت نہیں رہی
دیکھا، تو مثلِ اشک نظر سے گرا دیا — اب میری، اُس کی آنکھ میں عزّت نہیں رہی
رُندھتے سے جی کے، کس کو رہا ہے دِماغِ حرف؟ — دم لینے کی بھی ہم کو، تو فُرصت نہیں رہی
دیوانگی سے اپنی ہے اب ساری بات خبط — اِفراطِ اِشتیاق سے وہ مت نہیں رہی
پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ؟ — افسوس! تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

(۲۸)

تجھ کنے بیٹھے، گھٹا جاتا ہے جی — کاہشیں کیا کیا اُٹھا جاتا ہے جی؟
یوں تو مُردے سے پڑے رہتے ہیں ہم — پر وہ آتا ہے، تو آ جاتا ہے جی
اب کے اُس کی راہ میں، جو ہو سو ہو — یاد بھی آتا ہے، یا جاتا ہے جی
کیا کہیں تم سے؟ کہ اُس شُعلے بغیر — جی ہمارا، کچھ جلا جاتا ہے، جی!
عشق، آدم میں نہیں کچھ چھوڑتا — ہولے ہولے، کوئی کھا جاتا ہے جی
آ نہیں پھرتا، وہ مرتے وقت بھی — حیف ہے، اُس میں رہا جاتا ہے جی
اُٹھ چلے پر اُس کے غش کرتے ہیں ہم — یعنی ساتھ اُس کے چلا جاتا ہے جی
رکھتے تھے کیا کیا بِنا میں؟ پیشتر — سو تو اب، آپی ڈھا جاتا ہے جی
آسماں، شاید درے کچھ آ گیا — رات سے، کیا کیا؟ رکا جاتا ہے جی

(۲۹)

متاعِ دِل، اِس عشق نے سب جلادی
کوئی دِن ہی میں خاک سی یاں اُڑا دی

دلیل اِس بیاباں میں دِل ہی ہے اپنا
نہ خِضر و بلایاں، نہ رہبر، نہ ہادی

مزاجوں میں یاس آگئی ہے ہمارے
نہ مرنے کا غم ہے، نہ جینے کی شادی

نہ پوچھو، کہ چھاتی کے جلنے نے آخر
عجب آگ دِل میں، جگر میں لگادی

وفا لوگ آپس میں کرتے تھے آگے
یہ رسمِ کہن، آہ! تم نے اُٹھادی

جُدا اِن غزالانِ شہری سے ہوکر
پھرے ہم بگولے سے وادی بہ وادی

وہ نُسخہ جو دیکھا، بڑھا روگ دِل کا
طبیبِ محبت نے کیسی دوا دی؟

(۳۰)

الٰہی! کہاں مُنہ چُھپایا ہے تو نے؟
ہمیں کھو دیا ہے، تری جُستجو نے

جو خواہش نہ ہوتی، تو کاہش نہ ہوتی
ہمیں جی سے مارا، تری آرزو نے

نہ بھائیں تجھے میری باتیں، وگر نہ
رکھی دھوم شہروں میں اِس گفتگو نے

پھر اِس سال سے پھول سونگھا نہ میں نے
دِوانہ کیا تھا، مجھے، تیری بو نے

کُڑھایا کسو کو، کھپایا کسو کو
بُرائی ہی کی سب سے اُس خوب رو نے

تری چال ٹیڑھی، تری بات رُوکھی
تجھے میرؔ! سمجھا ہے یاں کم کسو نے

(۳۱)

دِلِ بے تاب، آفت ہے، بلا ہے
جگر سب کھا گیا، اب کیا رہا ہے؟

محبت کُشتہ ہیں ہم، یاں کسو پاس
ہمارے درد کی بھی کچھ دوا ہے؟

نہیں مِلتا سُخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب جُدا ہے

صبا اِدھر، گُل اُدھر، سرو اُدھر
فضولی ہے تجسّس یہ کہ کیا ہے؟

تماشا کردنی ہے داغِ سینہ
یہ پھول اِس تختے میں تازہ کھلا ہے

ہزاروں اُن نے کیں ایسی ادائیں
قیامت، جیسے اِک اُس کی ادا ہے

نہ عالم میں ہے، نے عالم سے باہر
پہ، سب عالم سے عالم ہی جُدا ہے

لگا میں گردِ سر پھرنے، تو بولا
تمھارا، میر صاحب! سر پھرا ہے

(۳۲)

یاد جب آتی ہے وہ زلفِ سیاہ
سانپ سا چھاتی پہ پھر جاتا ہے آہ!

یار کا وہ ناز، اپنا یہ نیاز
دیکھیے! ہوتا ہے کیوں کر یوں نباہ؟

دین میں اُس کافرِ بے رحم کے
اجر اِک رکھتا ہے خونِ بے گناہ

روٹھ کر، کیا آپ سے ملنے میں لطف؟
ہووے وہ بھی تو کبھو، ٹک عذر خواہ

ضبط بہتیرا ہی کرتے ہیں، ولے
آہ اِک، منھ سے نکل جاتی ہے گاہ

شیخ: تو نے خوب سمجھا میر کو
واہ وا! اے بے حقیقت! واہ واہ!

(۳۳)

برسوں تک جی کو مار مار رہے
رات دِن ہم اُمید وار رہے

موسمِ گُل، تلک رہے گا کون؟
چبھتے ہی دِل میں خار خار رہے

وصل یا ہجر، کچھ ٹھہر جاوے
دِل کو اپنے اگر قرار رہے

اُس کی آنکھوں کی مستی سے عاشق
چاہیے یوں کہ ہوشیار رہے

کم ہے کیا لذّتِ ہم آغوشی؟
سب مزے میر! در کِنار رہے

(۳۴)

کوئی ساحر اُس کو کچھ جادو کرے
وہ جو بے رُو، اِس طرف ٹک رُو کرے

دم میں ہو آئینۂ عالم سیاہ
ایک گر عاشق قلندر، ہُو کرے

کس سے تیری چاہیے دادِ ستم؟
کاش! اِنصاف اپنے دِل میں تو کرے

لوہو پانی ایک کر دیتا ہے عشق
پانی کر دے چشم، دِل لوہو کرے

اب جنوں میں میر اسوے دشت جائے
کارِ وحشت کے تئیں یک سو کرے

(۳۵)

تجاہل، تغافل، تساہل کیا　　ہوا کام مشکل، توکل کیا
نہیں تاب لاتا، دلِ زار اب　　بہت ہم نے صبر و تحمل کیا
زمینِ غزل، ملک سی ہوگئی　　یہ قطعہ، تصرف میں بالکل کیا
جنوں تھا نہ مجھ کو، نہ چپ رہ سکا　　کہ زنجیر ٹوٹی، تو میں غل کیا
نہ سوزِ دروں فصلِ گل میں چھپا　　سرِ سینہ سے داغ نے گل کیا
حقیقت، نہ میرؔ! اپنی سمجھی گئی　　شب و روز ہم نے تامل کیا

(۳۶)

چلے ہم، اگر تم کو اکراہ ہے　　فقیروں کی اللہ اللہ! ہے
نہ افسر ہے، نے دردِ سر، نے کلاہ　　کہ یاں جیسا سر، ویسا سرداہ ہے
جہاں تک چلے گل سے ہم داغ ہیں　　اگرچہ صبا بھی ہوا خواہ ہے
چراغانِ گل سے ہے کیا روشنی؟　　گلستاں کسو کی قدم گاہ ہے
نہ کی کوتہی بت پرستی میں کچھ　　خدا اس عقیدے سے آگاہ ہے
گیا میرؔ کے جی کی سن کر وہ شوخ　　لگا کہنے: سب کو یہی راہ ہے

(۳۷)

عشق کیا کیا آفتیں لاتا رہا؛　　آخر اس دوری میں جی جاتا رہا
مہر و مہ، گل، پھول، سب تھے، پر ہمیں　　چہرئی چہرہ ہی وہ بھاتا رہا
دل ہوا کب عشق کی رہ کا دلیل؛　　میں تو خود گم ہی اسے پاتا رہا
منھ دکھاتا برسوں وہ خوش رو نہیں　　چاہ کا یوں کب تلک ناتا رہا؟
کچھ نہ میں سمجھا جنون و عشق میں　　دیر ناصح مجھ کو سمجھاتا رہا
داغ تھا جو سر پہ میرے شمع ساں　　پانو تک مجھ کو وہی کھاتا رہا
کیسے کیسے رک گئے ہیں میرؔ ہم؛　　مدتوں منھ تک جگر آتا رہا

(۳۸)

داد فریاد جا بہ جا کریے — شاید، اُس کے بھی دل میں جا کریے
اب سُلگنے لگی ہے چھاتی بھی — یعنی، مُدّت پڑے جلا کریے
چشم و دل، جان مائلِ خوباں — بدی یاروں کی، کیا کیا کریے؟
دیکھیں، کب تک رہے ہے یہ صُحبت؟ — گالیاں کھائیے، دُعا کریے
کُچھ کہیں تو کہے ہے! یہ نہ کہو — کیوں کر اظہارِ مدّعا کریے؟
اتّفاق اُن کا مار ڈالے ہے — ناز و انداز کو جُدا کریے
ہستی مَوہوم و یک سرِ گردن — سیکڑوں، کیوں کے حق ادا کریے؟
سو تو ہر روز ہے بُرا احوال — متحیّر ہیں، آہ! کیا کریے؟
مُترتّب ہو نفع جو کُچھ بھی — دل کی بیماری کی دوا کریے
وہ نہیں سرگذشت سُنتا میر! — یُوں کہانی سی، کیا کہا کریے؟

(۳۹)

دل پہلو میں ناتواں بہت ہے — بیمار مرا گراں بہت ہے
ہر آن شکیب میں کمی ہے — بے تابی، زماں زماں بہت ہے
مقصود کو، دیکھیں! پہنچیں کب تک؟ — گردش میں تو آسماں بہت ہے
جی کو نہیں لاگ، لامکاں سے — ہم کو کوئی دل، مکاں بہت ہے
جاں بخشیِ غیر ہی کیا کر! — مُجھ کو یہی نیم جاں بہت ہے
اکثر پوچھے ہے، جیتے ہیں میر؟ — اب تو، کچھ مہرباں بہت ہے

(۴۰)

اِن بلاؤں سے کب رہائی ہے؟ — عشق ہے، فقر ہے، جُدائی ہے
اُستخواں کانپ کانپ جلتے ہیں — عشق نے آگ یہ لگائی ہے
نہ تو جذبِ رسا، نہ بختِ رسا — کیوں کے کہیے؟ کہ واں رسائی ہے

کہے تصنّع کہ اُس کے لب ہیں لعل
سب نے اِک بات یہ بنائی ہے

عشق دریا ہے ایک لنگر دار
تہ کسو نے بھی اُس کی پائی ہے؟

وہ نہ شرماوے کب تلک؟ آخر
دوستی، یاری، آشنائی ہے

کج روی یار کی نہیں جاتی
یہی بے طور، بے ادائی ہے

برسوں میں میر سے ملے، تو کہا
اِس سے پوچھو، کہ یہ کجائی ہے؟

(۱۴)

رنج کھینچے تھے، داغ کھائے تھے
دِل نے صدمے بڑے اُٹھائے تھے

پاسِ ناموسِ عشق تھا، ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے؟

وہی سمجھا نہ، ورنہ ہم نے تو
داغ چھاتی کے سب دِکھائے تھے

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یاں کبھو سرو و گل کے سائے تھے

کچھ نہ سمجھے، کہ تجھ سے یاروں نے
کس توقع پہ دِل لگائے تھے؟

فرصتِ زِندگی سے مت پوچھو!
سانس بھی ہم نہ لینے پائے تھے

میر صاحب رُلا گئے سب کو
کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

(۲۴)

اِس عہد میں اِلٰہی! محبت کو کیا ہوا؟
چھوڑا وفا کو اُن نے، مُروّت کو کیا ہوا؟

اُمیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے، یارو! قیامت کو کیا ہوا؟

جاتا ہے یار تیغ بہ کف غیر کی طرف
اے کُشتۂ ستم! تری غیرت کو کیا ہوا؟

بخشش نے مجھ کو ابرِ کرم کی کیا خجل
اے چشم! جوشِ اشکِ ندامت کو کیا ہوا؟

(۴۳)

اُس کا خرام دیکھ کے، جایا نہ جائے گا
اے کبک! پھر بحال بھی آیا نہ جائے گا

ہم رہروانِ راہِ فنا ہیں، بہ رنگِ عُمر
جاویں گے ایسے، کھوج بھی پایا نہ جائے گا

پھوڑا سا، ساری رات، جو پکتا رہے گا دِل
تو صُبح تک، تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا

اب دیکھ لے، کہ سینہ بھی تازہ ہُوا ہے چاک
پھر ہم سے اپنا حال دِکھایا نہ جائے گا

یاد اُس کی اِتنی، خوب نہیں، میر! باز آ
نادان! پھر وہ جی سے بُھلایا نہ جائے گا

(۴۴)

جیتے جی، کُوچۂ دِل دار سے جایا نہ گیا
اُس کی دیوار کا، سر سے مِرے سایا نہ گیا

وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا
ہم سے ہی حالِ تباہ اپنا دِکھایا نہ گیا

خاک تک کُوچۂ دِل دار کی چھانی ہم نے
جُستجو کی، پہ دلِ گُم شدہ پایا نہ گیا

دِل میں رہ دِل میں، کہ معمارِ قضا سے اب تک
ایَسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا

شہرِ دِل، آہ! عجب جائے تھی، پر اُس کے گئے
ایَسا اُجڑا، کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

(۴۵)

سحر گہ، عید میں دَورِ سُبُو تھا
پر، اپنے جام میں تُجھ بِن لہُو تھا

غلط تھا آپ سے غافل گُزرنا
نہ سمجھے ہم، کہ اِس قالِب میں تُو تھا

چمن کی وضع نے ہم کو کِیا داغ
کہ ہر غُنچہ، دلِ پُر آرزُو تھا

کرو گے یاد باتیں تو کہو گے
کہ کوئی رفتہ بسیار گو تھا

جہاں پُر ہے فسانے سے ہمارے
دِماغِ عِشق، ہم کو بھی کبھُو تھا

مگر، دیوانہ تھا گُل بھی کِسُو کا
کہ پَیراہن میں سو جاگہ رفُو تھا

نہ دیکھا میرِ آوارہ کو، لیکن
غُبارِ اِک ناتواں سا کُو بہ کُو تھا

(۴۶)

ہاتھ سے تیرے، اگر مَیں ناتواں مارا گیا
سب کہیں گے یہ، کہ کیا اِک نیم جاں مارا گیا؟

اک نگہ سے بیش، کچھ نقصاں نہ آیا اُس کے تئیں
اور میں بے چارہ تو اے مہرباں! مارا گیا

وصل و ہجراں، یہ جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی
دل غریب، اِن میں خدا جانے، کہاں مارا گیا؟

دل نے سر کھینچا دیارِ عشق میں، اے بوالہوس!
وہ سراپا آرزو، آخر جواں مارا گیا

کب نیازِ عشق، نازِ حُسن سے کھینچے ہے ہاتھ؟
آخر آخر میرؔ سر بر آستاں، مارا گیا

(۴۷)

دل عشق کا، ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

دل کی شکستگی نے ڈرائے رکھا ہمیں
واں چیں جبیں پر آئی، کہ یاں رنگ زرد تھا

مانندِ حرف، صفحۂ ہستی سے مٹ گیا
دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا

گزری مدام اُس کی، جوانانِ مست میں
پیرِ مغاں بھی، طُرفہ کوئی پیرِ مرد تھا

عاشق ہیں ہم تو میرؔ کے بھی ضبطِ عشق کے
دل جل گیا تھا، اور نفس لب پہ سرد تھا

(۴۸)

آہِ سحر نے سوزشِ دل کو مٹا دیا
اس باد نے ہمیں، تو دیا سا بجھا دیا

پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا، سو آج
بے طاقتی نے دل کی، وہ پردا اُٹھا دیا

تھی لاگ اُس کی تیغ کو ہم سے، سو عشق میں
دونوں کو معرکے میں گلے سے ملا دیا

سب شورِ ما و من کو لیے سر میں، مر گئے
یاروں کو اِس فسانے نے آخر سُلا دیا

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مُشتِ غُبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

اجزا بدن کے جتنے تھے، پانی ہو بہہ گئے
آخر گدازِ عشق نے ہم کو بہا دیا

ہم نے تو سادگی سے کیا جی کا بھی زیاں
دل جو دیا تھا، سو تو دیا، سر جُدا دیا

اُن نے تو تیغ کھینچی تھی، پر جی چلا کے میرؔ
ہم نے بھی ایک دم میں تماشا دکھا دیا

(۴۹)

کس کی مسجد، کیسے مے خانے، کہاں کے شیخ و شاب؟
ایک گردش میں تری چشمِ سیہ کی سب خراب

مُوند رکھنا چشم کا ہستی میں، عینِ دید ہے
کچھ نہیں آتا نظر، جب آنکھ کھولے ہے حباب

تو ہو اور دُنیا ہو ساقی! مَیں ہوں مستی ہو مُدام   پر، بطِ صہبا نکالے، اُڑ چلے رنگِ شراب
کیا ہو رنگِ رفتہ؟ کیا قاصد ہو؟ جس کو خط دیا   جُز جوابِ صاف، اُس سے کب کوئی لایا جواب؟
کچھ نہیں، بحرِ جہاں کی موج پر مت بھول میرؔ!   دُور سے دریا نظر آتا ہے، لیکن ہے سراب

(۵۰)

اے ابرِ تر! تو اَور کسی سمت کو برس   اِس مُلک میں ہماری ہے یہ چشمِ تر ہی بس
مژگاں بھی بہ گئیں مِرے رونے سے چشم کے   سَیلاب موج مارے، تو ٹھہرے ہے کوئی خس؟
مجنوں کا دِل ہوں، محملِ لیلیٰ سے ہوں جُدا   تنہا پھِروں ہوں دشت میں، جوں نالۂ جرس
اے نالہ! اُس کے دِل میں اثر خوب ہی کیا   روتا ہوں جب مَیں سامنے اُس کے، تو دے ہے ہنس
اُس کی زباں کے عہدے سے کیوں کر نکل سکوں؟   کہتا ہوں ایک مَیں، تو سُناتا ہے مجھ کو دس
حیراں ہوں میرؔ! نزع میں اب کیا کروں بھلا؟   احوالِ دِل بہت ہے، مجھے فُرصت اِک نفس

(۵۱)

میں کون ہوں اے ہم نفساں! سوختہ جاں ہوں   اِک آگ مِرے دِل میں ہے، جو شعلہ فشاں ہوں
لایا ہے مِرا شوق مجھے پردے سے باہر   مَیں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں
جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر   صد رنگ مِری موج ہے، مَیں طبعِ رواں ہوں
دیکھا ہے مجھے جِس نے، سو دیوانہ ہے میرا   مَیں باعثِ آشفتگیِ طبعِ جہاں ہوں
تکلیف نہ کر، آہ! مجھے جُنبشِ لب کی   مَیں صد سخن آغشتہ بہ خوں، زیرِ زباں ہوں
رکھتی ہے مجھے خواہشِ دِل، بس کہ پریشاں   درپَے نہ ہو، اِس وقت خدا جانے کہاں ہوں
اِک وہم نہیں بیش مِری ہستیِ موہوم   اُس پر بھی تِری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں؟

(۵۲)

دِل گیا، ہوش گیا، صبر گیا، جی بھی گیا   شغل میں غم کے تِرے، ہم سے گیا، کیا کیا کچھ؟
آہ، مت پوچھ ستم گار! کہ تجھ سے تھی ہمیں   چشمِ لُطف و کرم و مہر و وفا، کیا کیا کچھ؟
حسرتِ وصل و غمِ ہجر و خیالِ رُخِ دوست   مر گیا مَیں، پہ مِرے جی میں رہا، کیا کیا کچھ؟

دردِ دل، زخمِ جگر، کلفتِ غم، داغِ فراق — آہ! عالم سے، مِرے ساتھ چلا، کیا کیا کچھ؟
چشمِ نمناک و دلِ پُر، جگرِ صد پارہ — دولتِ عشق سے ہم پاس بھی تھا، کیا کیا کچھ؟
ایک محروم چلے، میر! ہمیں عالم سے — ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ؟

(۵۳)

کم فرصتیِ گُل جو کہیں، کوئی نہ مانے — ایسے گئے ایّامِ بہاراں، کہ نہ جانے
مرتے ہی سُنے ہم نے کسل مندِ محبت — اِس درد میں کس کس کو کیا نفع دوا نے؟
ٹک آنکھ بھی کھولی نہ زخود رفتہ نے اُس کے — ہر چند کیا شور، قیامت نے سرہانے
کب کب مِری عزّت کے لیے بیٹھے ہو ٹک پاس؟ — آئے بھی جو ہو، تو مجھے مجلس سے اُٹھانے
مجروح بدن سنگ سے طفلاں کے نہ ہوتے — کم جاتے جو اُس کوچہ میں، پر ہم تھے دِوانے
آنے میں تعلّل ہی کیا، عاقبتِ کار — ہم جی سے گئے، پر نہ گئے اُس کے بہانے
گلیوں میں بہت ہم تو پریشاں سے پھرے ہیں — اوباش کسی روز لگا دیں گے ٹھکانے

(۵۴)

لذّت سے نہیں خالی، جانوں کا کھپا جانا — کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا؟
تھا ناز بہت ہم کو، دانست پر اپنی بھی — آخر وہ بُرا نکلا، ہم جس کو بھلا جانا
اِس گریۂ خونیں کا ہو ضبط تو بہتر ہے — اچھا نہیں، چہرے پر لوہو کا بہا جانا
اُس شمع کی مجلس میں، جانا ہمیں، پھر واں سے — اِک زخمِ زباں تازہ، ہر روز اُٹھا جانا
اے شورِ قیامت! ہم سوتے ہی نہ رہ جائیں — اِس راہ سے نکلے تو، ہم کو بھی جگا جانا
ہے میری تِری نسبت رُوح اور جسد کی سی — کب آپ سے میں تجھ کو، اے جان! جُدا جانا؟
جاتی ہے گزر جی پر اُس وقت قیامت سی — یاد آوے ہے جب تیرا یک بارگی آ جانا
کب میر! بسر آئے؟ تم ویسے فریبی سے — دِل کو تو لگا بیٹھے، لیکن نہ لگا جانا

(۵۵)

یہ میرِ ستم کشتہ، کسو وقت جواں تھا — اندازِ سخن کا، سببِ شور و فغاں تھا

جادو کی پڑی، پرچۂ ابیات تھا اُس کا
مُنھ تکیے غزل پڑھتے، عجب سحر بیاں تھا

جس راہ سے، وہ دل زدہ دلّی سے نکلتا
ساتھ اُس کے، قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا

افسردہ نہ تھا ایسا، کہ جوں آب زدہ خاک
آندھی سی تھا، بلا تھا، کوئی آشوبِ جہاں تھا

گو، میرؔ! جہاں میں کنھوں نے تجھ کو نہ جانا
موجود نہ تھا تو، تو کہاں نام و نشاں تھا؟

(٥٦)

آنسو مری آنکھوں میں، ہر دم جو نہ آجاتا
تو کام مرا اچھا، پردے میں چلا جاتا

اصلح ہے حجاب اُس کا، ہم شوق کے ماروں سے
بے پردہ جو وہ ہوتا، تو کس سے رہا جاتا؟

صد شکر، کہ داغِ دل، افسردہ ہُوا، ورنہ
یہ شعلہ بھڑکتا تو گھر بار جلا جاتا

کہتے تو ہو! یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا
یہ کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا

گر عشق نہیں ہے، تو یہ کیا ہے؟ بھلا مجھ کو
جی، خود بہ خود اے ہمدم! کاہے کو کھپا جاتا؟

(٥٧)

ہم تم سے چشم رکھتے تھے، دلدار! یاں بہت
سو، التفات کم ہے، دل آزاریاں بہت

دیکھیں تو کیا دکھائے یہ افراطِ اشتیاق؟
لگتی ہیں تیری آنکھیں ہمیں پیاریاں بہت

جب تک، ملی جلی سی جفائیں تھیں، اُٹھ سکیں
کرنے لگے ہو اب تو ستم گاریاں بہت

آزار ہیں تو عشق کے، جاتا ہے بھول جی
یوں تو ہوئی تھیں یاد ہمیں، بیماریاں بہت

شکوہ خراب ہونے کا کیا! چاہیے ہیں، میرؔ!
ایسی تو اے عزیز! ہیں یاں خواریاں بہت

(٥٨)

عشق میں، اے طبیب! یاں ٹک سوچ!
پاے جاں درمیاں ہے یاں، ٹک سوچ!

بے تأمل اداے کیں مت کر!
قتل میں میرے، مہرباں! ٹک سوچ!

سرسری مت جہاں سے جا، غافل!
پانو تیرا پڑے جہاں، ٹک سوچ!

پھیل اتنا پڑا ہے کیوں؟ یاں تو!
یار اگلے گئے کہاں؟ ٹک سوچ!

ہونٹھ اپنا ہلا نہ سمجھے بن
یعنی جب کھولے تو زباں، ٹک سوچ!

گُل و رنگ و بہار، پردے ہیں — ہر عیاں میں ہے وہ نہاں، ٹک سوچ!
فائدہ سر جُھکے کا شَیب میں میرؔ! — پیری سے آگے اے جواں! ٹک سوچ!

(۵۹)

اب اُس کے غم سے جو کوئی چاہے، سو کھائے داغ — باقی نہیں ہے چھاتی میں اپنی، تو جائے داغ
چشم و دِل و دِماغ و جِگر، سب کو رو رہے — اِس عشقِ خانہ سوز نے، کیا کیا دِکھائے داغ؟
جی جل گیا تقرّبِ اغیار دیکھ کر — ہم اُس گلی سے جب گئے، تب واں سے لائے داغ
کیا لالہ ایک داغ پہ پھولے ہے باغ میں؟ — بہتیرے ہم نے چھاتی میں ویسے جلائے داغ
دِل کی گرہ میں غنچہ، لالہ کے رنگ میرؔ! — سوزِ دروں سے کچھ نہیں ہے، اب سوائے داغ

(۶۰)

آج ہمارے گھر آیا تو کیا ہے یاں؟ جو نثار کریں
اِلّا کھینچ بغل میں تجھ کو، دیر تلک ہم پیار کریں
خاک ہوئے برباد ہوئے، پامال ہوئے، سب محو ہوئے
اور شدائد عشق کی رہ کے کیسے ہم ہموار کریں؟
زردیِ رُخ، رونا ہر دم کا، شاہد دو جب ایسے ہوں
چاہت کا، انصاف کرو تم، کیوں کر ہم اِنکار کریں؟
شیوہ اپنا بے پروائی، نومیدی نے ٹھہرا ہے
کچھ بھی وہ مغرور دبے تو منّت ہم سو بار کریں
پتا پتا گلشن کا تو، حال ہمارا جانے ہے
اور کہے تو جس سے اے گُل! بے برگی اظہار کریں

(۶۱)

کیا کہیں، آتشِ ہجراں سے گلے جاتے ہیں — چھاتیاں سُلگیں ہیں ایسی کہ جلے جاتے ہیں
گوہرِ گوش کِسو کا نہیں جی سے جاتا — آنسو موتی سے مِرے مُنھ پہ ڈھلے جاتے ہیں

بھی مسدود ہے کچھ راہِ وفا، ورنہ بہم
سب کہیں نامہ و پیغام چلے جاتے ہیں

حیرتِ عشق میں تصویر سے رفتہ ہی رہے
ایسے جاتے ہیں جو ہم بھی، تو بھلے جاتے ہیں

ہجر کی کوفت جو کھینچے ہیں، اُنھیں سے پوچھو
دِل دِیے جاتے ہیں، جی اپنے ملے جاتے ہیں

(۶۲)

عِشق میں ذِلّت ہُوئی، خِفّت ہُوئی، تُہمت ہُوئی
آخر آخر جان دی یاروں نے، یہ صُحبت ہُوئی

کھولتے ہی آنکھیں، پھر یاں مُونْدنی ہم کو پڑیں
دید کیا کوئی کرے؟ وہ کِس قدر مُہلت ہُوئی

پانو میرا، کلبۂ احزاں میں اب رہتا نہیں
رفتہ رفتہ، اُس طرف جانے کی مُجھ کو لت ہُوئی

دِل کا جانا، آج کل تازہ ہُوا ہو، تو کہوں
گُزرے اُس بھی سانحے کو، ہم نشیں! مدت ہُوئی

کیا کفِ دست ایک میداں تھا، بیاباں عِشق کا
جان سے جب اُس میں گزرے، تب ہمیں راحت ہُوئی

بے زباں جو مُجھ کو کہتے ہیں، سو چُپ رہ جائیں گے
معرکے میں حشر کے، گر بات کی رُخصت ہُوئی

اِس غزل پر، شام سے تو صوفیوں کو وجد تھا
پھر نہیں معلوم کُچھ، مجلس کی کیا حالت ہُوئی؛

کم کِسُو کو، میرؔ کی میّت کی، ہاتھ آئی نماز
نعش پر اُس بے سر و پا کی، بلا کثرت ہُوئی

(۶۳)

اب اپنے قدِ راست کو خم، دیکھتے ہیں ہائے!
ہستی کے تئیں ہوتے عدم، دیکھتے ہیں، ہائے!

سُنتے تھے کہ جاتی ہے تِرے دیکھنے سے جاں
اب جان چلی جاتی ہے، ہم دیکھتے ہیں، ہائے!

کیا روتے ہیں؟ یارانِ گزشتہ کے لیے ہم
جب راہ میں کُچھ نقشِ قدم، دیکھتے ہیں، ہائے!

کُچھ عِشق کی آتش کی لپٹ پہنچی ہمیں زور
سب تن بدن اپنے کو، بھسم دیکھتے ہیں، ہائے!

دِل چاک ہے، جاں داغ، جِگر خوں ہے ہمارا
اِن آنکھوں سے انواعِ سِتم دیکھتے ہیں، ہائے!

مایوس نہ کِس طور جہاں سے رہیں ہم میرؔ!
اب تاب بہت جان میں کم دیکھتے ہیں، ہائے!

(۶۴)

ہنستے رہتے تھے جو اِس گُلزار میں شام و سحر
دیدۂ تر ساتھ لے، وے لوگ جوں شبنم گئے

کیا کم اُس خورشید رُو کی جُستجو یاروں نے کی
لو ہو روتے جوں شفق، پُورب گئے، پچھم گئے

بھی گیا یاں بے دماغی سے آنکھوں کی، اور واں
نے جبیں سے چیں گئی، نے ابروؤں سے خم گئے

شاید اب ٹکڑوں نے دل کے، قصدِ آنکھوں کا کیا
کچھ سبب تو ہے، جو آنسو آتے آتے تھم گئے

گرچہ، ہستی سے عدم تک، اِک مسافت تھی بعید
پر، اُٹھے جو ہم یہاں سے، واں تلک اک دم گئے

سبزہ و گُل، خوش نصیبی اِس چمن کی جن کو تھی
سو بھی تو دیکھا، گریباں چاک، آنکھیں نم گئے

ربط صاحبِ خانہ سے مطلق بہم پہنچا نہ میر!
مدتوں سے ہم حرم میں تھے، پہ نامحرم گئے

(۶۵)

تنگ ٹھہرنے دے تجھے شوخی، تو کچھ ٹھہرائیے
پیکرِ نازک کو تیرے کیوں کہ بر میں لائیے؟

ساکنِ دَیر و حرم دونوں تلاشی ہیں ترے
تو خدا جانے کہاں ہے، کیوں کہ تجھ کو پائیے؟

دُور ہی سے ہوش کھو دیتی ہے اُس کی بوئے خوش
آپ میں رہیے، تو اُس کے پاس بھی ٹک جائیے

اِن دنوں رنگ اَور کچھ ہے اِس دلِ پُر خوں کا
حق میں میرے آپ ہی کچھ سوچ کر فرمائیے

جی ہی گھٹ جاتا ہے طنز آمیز ایسے لطف سے
ہنس کے جب کہتا ہے سب میں، آئیے، جی آئیے!

رات دن رُخسار اُس کے چت چڑھے رہتے ہیں میر!
آفتاب و ماہ سے دِل کب تلک بہلائیے؟

(۶۶)

کیا پوچھتے ہو، عاشق راتوں کو کیا کرے ہے؟
گاہے بُکا کرے ہے، گاہے دُعا کرے ہے

دانستہ اپنے جی پر، کیوں تو جفا کرے ہے؟
اِتنا بھی میرے پیارے! کوئی کُڑھا کرے ہے؟

ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں، لیکن
سینے میں جیسے دِل کو، کوئی ملا کرے ہے

کیا کہیے! داغِ دِل ہے، ٹکڑے جگر ہے سارا
جانے وہی جو کوئی، ظالم! وفا کرے ہے

گرم آ کر ایک دِن وہ، سینے سے لگ گیا تھا
تب سے ہماری چھاتی ہر شب جلا کرے ہے

کیا چال یہ نکالی، ہو کر جوان تم نے؟
اب جب چلو ہو، دِل کو ٹھوکر لگا کرے ہے

اِک آفتِ زماں ہے، یہ میر عشق پیشہ
پردے میں، سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

(۶۷)

درویشوں سے تو اُن نے ضدیں نکالیاں ہیں
اِیدھر سے ہیں دُعائیں، اُودھر سے گالیاں ہیں

جب لگ گئے جھمکنے ، رُخسارِ یار دونوں / تب مہر و مہ نے اپنی آنکھیں چُرالیاں ہیں
صُبحِ چمن کا جلوہ ، ہندی بُتوں میں دیکھا / صندل بھری جبیں ہیں، ہونٹوں کی لالیاں ہیں
درد و الم ہی میں سب جاتے ہیں روز و شب یاں / دن اشک ریزیاں ہیں، شب زار نالیاں ہیں
اِن گل رُخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں / جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں
اُس آفتاب بِن یاں اندھیر ہو رہا ہے / دن بھی سیاہ اپنے جوں راتیں کالیاں ہیں
چلتے ہیں یہ ، تو ٹھوکر لگتی ہے میر! دِل کو / چالیں ہی دِلبروں کی سب سے نرالیاں ہیں

(۶۸)

شہروں، مُلکوں میں، جو یہ میرؔ کہاتا ہے میاں! / دیدنی ہے، پہ بہُت کم نظر آتا ہے، میاں!
عالم آئینہ ہے جس کا، وہ مُصوّر بے مثل / ہائے! کیا صورتیں پردے میں بناتا ہے میاں!
قسمت اُس بزم میں لائی کہ جہاں کا ساقی / دے ہے مے سب کو، ہمیں زہر پلاتا ہے میاں!
ہو کے عاشق ترے، جان و دِل و دیں کھو بیٹھے / جیسا کرتا ہے کوئی، ویسا ہی پاتا ہے میاں!
حُسن یک چیز ہے، ہم ہو دیں کہ تو ہو ناصح! / ایسی شے سے بھی کوئی ہاتھ اُٹھاتا ہے! میاں!

(۶۹)

قتل کیجے، پر غُصّہ کیا ہے! لاش مری اُٹھوانے دو / بہانے بھی ہم جاتے رہے ہیں، تُم بھی آؤ جانے دو
اُس کی گلی کی خاک سبھوں کے دامنِ دِل کو کھینچے ہے / ایک اگر جی لے بھی گیا، تو آتے ہیں، مر جانے دو
اب کے بہُت ہے شورِ بہاراں، ہم کو مت زنجیر کرو / دِل کی ہوس ٹک ہم بھی نکالیں، دھومیں ہم کو مچانے دو
عرصہ کتنا سارے جہاں کا! وحشت پر جو آجاویں / پانو تو ہم پھیلاویں، پر فرصت ہم کو پانے دو
بات بنانا مشکل ہے، شعر سبھی یاں کہتے ہیں / فکرِ بلند سے یاروں کو، ایک ایسی غزل کہہ لانے دو
ضُعف بہُت ہے میرؔ! تمھیں کچھ اُس کی گلی میں مت جاؤ / صبر کرو، کچھ اور بھی صاحب! طاقت جی میں آنے دو

(۷۰)

آئینہ سا جو کوئی یاں صورت آشنا ہے اب / بے مروّت، اِس زمانے میں ہمہ حیرت ہے اب
کیا کوئی، یاری کسو سے کر کے، ہووے شاد کام / دوستی ہے دشمنی، اُلفت نہیں کُلفت ہے اب

چاہتا ہے درد دِل گر ناکسوں سے دِل دِماغ
سو دماغ اپنا ضعیف، قلب بے طاقت ہے اب

کیوں کہ دُنیا دُنیا، رُسوائی مری موقوف ہو؟
عالم عالم، مجھ پہ اُس کے عشق کی تہمت ہے اب

اشک نومیدانہ پھرتے ہیں مری آنکھوں کے بیچ
میر! یہ دے ہے دِکھائی، جان کی رُخصت ہے اب

(۷۱)

تسکین دردمندوں کو، یارب! شتاب دے
دِل کو ہمارے چین دے، آنکھوں کو خواب دے

اُس کا، غضب ہے نامہ نہ لکھنا، تو سہل ہے
لوگوں کے پوچھنے کا، کوئی کیا جواب دے؟

گُل ہے، بہار تب ہے، جب آنکھوں میں ہو نشہ
جاتی ہے فصلِ گُل، کہیں ساقی! شراب دے

وہ تیغ، میری تِشنہ خوں ہو گئی ہے کُند
کر رحم مجھ پہ، کاش کہ یار اُس کو آب دے

مژگانِ تر کو یار کے چہرے پہ کھول! میر!
اِس آب خستہ سبزے کو ٹک آفتاب دے

(۷۲)

اے کاش! مرے سر پر اک بار وہ آ جاتا
ٹھہراؤ سا ہو جاتا، یوں جی نہ چلا جاتا

تب تک ہی تحمّل ہے، جب تک نہیں آتا وہ
اِس رستے نکلتا، تو ہم سے نہ رہا جاتا

اِک آگ لگا دی ہے، چھاتی میں جُدائی نے
وہ مہ گلے لگتا، تو یوں دِل نہ جلا جاتا

یا لاگ کی وے باتیں، یا ایسی ہے بے زاری
وہ جو نہ لگا لیتا، تو مَیں نہ لگا جاتا

اِس شوق نے دِل کے بھی، کیا بات بڑھائی ہے!
رُقعہ اُسے لکھتے، تو طُومار لکھا جاتا

وِسواس نہ کرتا تھا مر جانے سے ہجراں میں
تھا میر تو ایسا بھی، دِل جی سے اُٹھا جاتا

(۷۳)

دِل کو کہیں لگنے دو میرے، کیا کیا رنگ دکھاؤں گا
چہرے سے خوں ناب مَلوں گا، پھولوں سے گُل کھاؤں گا

عہد کیے جاؤں ہوں لب کی، آخر مجھ کو غیرت ہے
تو بھی منانے آوے گا، تو ساتھ نہ تیرے جاؤں گا

گرچہ نصیحت سب ضائع ہے، لیکن خاطرِ ناصح کی
دِل دیوانہ کیا سمجھے گا؟ اَور بھی میں سمجھاؤں گا

جھک کے سلام کسو کو کرنا، سجدہ ہی ہو جاتا ہے
سر جاوے گا اِس میں میرا، سر نہ فرو مَیں لاؤں گا

مر گئے سے مراد یہ سب ہے، ہجر کے اُس کی کلفت میں
سر کو کاٹ کے ہاتھ پہ رکھے، آپ بھی ملنے جاؤں گا

خاک ملا ہوں منھ آنکھوں میں، چاک گریباں تا دامن
صورت حال اب اپنی اُس کے خاطر خواہ بناؤں گا

دِل کے تئیں اِس راہ میں کھو، افسوس کہاں اب پھرتا ہوں
یعنی رفیقِ شفیق پھر ایسے میرؔ! کہاں میں پاؤں گا؟

(۷۴)

جب سے آنکھیں لگی ہیں ہماری، نیند نہیں آتی ہے رات
تکتے راہ رہے ہیں دِن کو، آنکھوں میں جاتی ہے رات

سخت ہیں کیا ایامِ جدائی، دشواری سے کٹتے ہیں
دِن دیوار دِل سے سر ماروں ہوں، پتھر سے چھاتی ہے رات

جوں توں، ہجر میں غم میں اُس کے، شام و سحر ہم کرتے ہیں
ورنہ کسے دِن خوش آتا ہے! کس کے تئیں بھاتی ہے رات؛

رات کو جس میں چین سے سوویں، سو تو اُس کی جدائی میں
شمع نمط جلتے رہتے ہیں اور ہمیں کھاتی ہے رات

روز و شب کی اپنی معیشت، نقل کریں کیا تم سے میرؔ!
دِن کو قیامت جی پہ رہے ہے، شب کو بلا لاتی ہے رات

(۷۵)

یارب! اُس محبوب کو پھر اِک نظر دیکھیں گے ہم
اپنی آنکھوں سے، اُسے یاں جلوہ گر دیکھیں گے ہم

میں کہا، دیکھو اِدھر ٹک تم، تو میں بھی جان دوں
ہنس کے بولے، یہ تری باتیں ہیں، پر دیکھیں گے ہم

پاس ظاہر ہے اُسے، تو دیکھنا دشوار ہے
جائیں گے مجلس میں تو، اِدھر اُدھر دیکھیں گے ہم

یوں نہ دیں گے دِل، کسو سیمیں بدن، زردست کو
ابتدائے عشق میں، اپنا بھی گھر دیکھیں گے ہم

کام، کہتے ہیں سماجت سے کبھو لیتے ہیں لوگ
ایک دِن اُس کے کنے جا کر، پھر دیکھیں گے ہم

راہ تکتے تکتے اپنی آنکھیں بھی پتھرا چلیں
یہ نہ جانا تھا کہ سختی اِس قدر دیکھیں گے ہم

شورشِ دیوانگی اُس کی نہیں جائے گی میرؔ!
ایک دو دِن میرؔ کو زنجیر کر دیکھیں گے ہم

(۷۶)

باغ میں سیر، کبھو ہم بھی کیا کرتے تھے
روشِ آبِ رواں پھیلے پھرا کرتے تھے

غیرتِ عشق کسو وقت بلا تھی ہم کو
تھوڑی آزردگی میں ترک مِلا کرتے تھے

دِل کی بیماری سے، خاطر تو ہماری تھی جمع
لوگ کچھ یوں ہی محبت سے دوا کرتے تھے

جب تلک شرم رہی مانعِ شوخی اُس کی
تب تلک ہم بھی، ستم دیدہ، حیا کرتے تھے

اب تو بے تابیِ دِل نے ہمیں بٹھلا ہی دیا
آگے رنج و تعبِ عشق اُٹھا کرتے تھے

اُٹھ گئے، پر مرے بکنے کو کہیں لگے یاں میرؔ! — دردِ دل، بیٹھے کہانی سی کہا کرتے تھے

(۷۷)

صبر کیا جاتا نہیں ہم سے، ضعف بھی ہے بے تابی ہے — سہل نہیں ہے جی کا ڈھہنا، کیسی خانہ خرابی ہے

آگے ایسا نکھرا نکھرا کاہے کو میں پھرتا تھا؟ — جب سے آنکھ لگی اُس مُنھ سے، رنگ مرا مہتابی ہے

کس سے سبب میں پوچھوں! یا رب! اپنی سوزشِ سینہ کا — چھاتی جو جلتی رہتی ہے ات گت، آگ مگر یاں دابی ہے

رنج و محن نے عشق کے مجھ کو، راحت سے مایوس کیا — دل کے تیں بے تابی ہے میرؔ، آنکھوں کو بے خوابی ہے

ابر کوئی رویا ہے شاید برسوں وادیِ ایمن میں — سیر کیا وہ قطعہ زمیں کا، اب تک بھی سیرابی ہے

شہرِ حسن عجب بستی ہے، ڈھونڈھے پیدا مہر نہیں — ہے تو متاعِ گراں قیمت، پھر اُس کی بلا نایابی ہے

در بہ در رسوا و عاشق، شاعر، شاغل، کامل، میرؔ — گھر کعبے میں، دیر میں گھر ہے، کیا کافر ہرابی ہے!

(۷۸)

دل کھلتا ہے واں، صحبتِ رندانہ جہاں ہو — میں خوش ہوں اُسی شہر سے، مے خانہ جہاں ہو

اِن بکھرے ہوئے بالوں سے، خاطر ہے پریشاں — وے جمع ہوئے پر ہیں بلا، شانہ جہاں ہو

رہنے سے مرے پاس کے، بدنام ہوئے تم — اب جا کے رہو واں کہیں، رُسوا نہ جہاں ہو

کچھ حال کہیں اپنا، نہیں بے خودی تجھ کو — غش آتا ہے لوگوں کو، یہ افسانہ جہاں ہو

کیوں جلتا ہے ہر جمع میں مانندِ دیے کے — اُس بزم میں جا شمع سا، پروانہ جہاں ہو

اِن اُجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا — ہے جی میں، وہیں جا بسیں، ویرانہ جہاں ہو

وحشت ہے خردمندوں کی صحبت سے مجھے میرؔ! — اب جا رہوں گا واں، کوئی دیوانہ جہاں ہو

(۷۹)

کہتے نہ تھے ہم تم سے، دل ہاتھ سے مت دیجو! — مت کھائیو غم اپنا، اپنا نہ لہو پیجو!

اُن پلکوں کی کاوش سے، زخمی ہے جگر سارا — لے تار نگاہوں کے، نازک سا رفو کیجو!

کیا جان ہے جس کے جاناں سے چھپانا مُنھ — جیسا تو کوئی دل ہے، تم میرؔ! بہت جیجو

دل خستہ، شکستہ دل، دل بستہ، گرفتہ دل — ہو ان میں کوئی، اُس کا دل ہاتھ میں ٹک لیجو

اِس راہ سے کرتا ہے، دِل، اکثر ہوا گاہے — میرے پھٹے سینے کو زِنہار نہ تم سیجو!

(۸۰)

آنکھوں کی طرف، گوش کے، در پردہ خبر ہے — کچھ یار کے آنے کی، مگر، گرم خبر ہے
یہ راہ و روش، سروِ گلستاں میں نہ ہوگی — اِس قامتِ دلچسپ کا انداز دِگر ہے
وہ ناوکِ دِل دوز ہے لاگو، مرے جی کا — تو سامنے ہو ہم دم! اگر تجھ کو جگر ہے
کیا پھیل پڑی! مُدّتِ ہجراں کو نہ پوچھو — مَہ، سال ہُوا ہم کو، گھڑی ایک پہر ہے
تجھ سا تو سوار ایک بھی محبوب نہ نکلا — جس دِلبرِ خود کام کو دیکھا، سو نفر ہے
شب شور و فغاں کرتے گئی تجھ کو، تو اب تو — دم کش ہو ٹک اے مُرغِ چمن! وقتِ سحر ہے
سوچے تھے، کہ سودائے محبّت میں ہے کچھ سود — اب دیکھتے ہیں، اُس میں تو جی ہی کا ضرر ہے
ہر بیت میں کیا میر! تری باتیں گُتھی ہیں — کچھ اور سُخن کر، کہ غزل سلکِ گہر ہے

(۸۱)

اے شمع! اِقامت کدہ اِس بزم کو مت جان — روشن ہے ترے چہرے سے، تو گرمِ سفر ہے
اِس عاشقِ دیوانہ کی مت پوچھ معیشت — دنداں بہ جگر، دست بہ دِل، ہاتھ بہ سر ہے
کیا آگ کی چنگاریاں سینے میں بھری ہیں! — جو آنسو مری آنکھ سے گرتا ہے، شرر ہے
دیدار کے مُشتاق ہیں سب حُسن کے، اب اُس کی — کچھ شورشِ ہنگامۂ محشر میں خبر ہے
سب چاہتے ہیں رُشد مرا یُوں تو، پر اے میر! — شاید یہی اِک عیب ہے مانع، کہ ہنر ہے

(۸۲)

پتّا پتّا، بُوٹا بُوٹا، حال ہمارا جانے ہے — جانے نہ جانے، گُل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے
عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دُنیا میں — جی کے زیاں کو عشق میں اُس کے، اپنا وارا جانے ہے
چارہ گری بیماریِ دِل کی، رسمِ شہرِ حُسن نہیں — ورنہ دِلبرِ ناداں بھی، اِس درد کا چارا جانے ہے
مہر و وفا و لُطف و عنایت، ایک سے واقف اِن میں نہیں — اور تو سب کچھ طنز و کنایہ، رمز و اشارا جانے ہے
عاشق تو مُردہ ہے ہمیشہ، دیکھے سے جی اُٹھتا ہے — یار کے آجانے کو یکایک، عُمر دوبارا جانے ہے

کیا کیا فتنے، سر پر اُس کے، لاتا ہے معشوق اپنا
جس بے دل، بے تاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے

تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا! میرؔ بھی ناداں تلخی کش
دم دار آبِ تیغ کو اُس کے، آبِ گوارا جانے ہے

(۸۳)

جو کوئی خستہ جگر، عشق کا آزاری ہے
جی میں چکا وہ، کہ یہ بے طرح کی بیماری ہے

پلکیں وہ اُس کی پھری، جی میں گُھبی جاتی ہیں
آنکھ وہ دیکھے کوئی، شوخی میں کیا پیاری ہے!

بے قراری میں، نہ دلبر سے اُٹھا ہرگز ہاتھ
عشق کرنے کے تئیں، شرط جگرداری ہے

جُرم بے جُرم کھنچی رہتی ہے جس کی شمشیر
اُس ستم گار، جفا جُو سے ہمیں یاری ہے

آنکھ، مستی میں کسو پر نہیں پڑتی اُس کی
یہ بھی اُس سادہ و پُرکار کی ہشیاری ہے

واں سے کچھ ناز و تبختر نہیں کچھ، یاں سے میرؔ!
عجز ہے، دوستی ہے، عشق ہے، غم خواری ہے

(۸۴)

دردِ غم سے، دل کبھی فرصت نہ پائے
یہ صعوبت، کب تلک کوئی اُٹھائے؟

زار رونا چشم کا، کب دیکھتے؟
دیکھیں ہیں، لیکن خدا جو کچھ دکھائے

کب تلک، چاکِ قفس سے جھانکیے؟
برگِ گل، یاں بھی صبا! کوئی تو لائے

اُس کی، اپنی، بنتی ہی ہرگز نہیں
بگڑی صُحبت ایسی، کیا کوئی بنائے؟

جو لکھی قسمت میں ذلّت، ہو سو ہو
خطِّ پیشانی کوئی کیوں کر مٹائے؟

میرؔ! اکثر عُمر کے افسوس میں
زیرِ لب، بالائے لب ہے ہائے، وائے!

(۸۵)

کیا کہیں؟ ہے حالِ دل درہم بہت
کُڑھتے ہیں دن رات اُس پر ہم بہت

رہتا ہے ہجراں میں غم، غصّے سے کام
اور وے بھی، سُن کے ہیں برہم بہت

اضطراب اِس کا نہیں ہوتا ہے کم
ہاتھ بھی رکھتے ہیں دل پر ہم بہت

اُس گلی سے جی اُچٹتا ٹک نہیں
دل، جگر، کرتے ہیں پتھر ہم بہت

میرؔ کی بدحالیِ شب مذکور تھی
کُڑھ گئے یہ حال سُن کر ہم بہت

(۸۶)

کھا گئے یاں کے فکر، سو مو ہوم — واں گئے کیا ہو؟ کچھ نہیں معلوم

وصل کیوں کر ہو اُس خوش اختر کا؟ — جذب ناقص ہے، اور طالع شوم

نہ ہوئے تھے ابھی جوان افسوس! — صبرِ مغفور و طاقتِ مرحوم

جب غبار اپنے دِل کا نکلے ہے — دیر رہتی ہے آندھی کی سی دھوم

ہے عبث یہ تردد و تشویش — پہنچے ہے وقت پر، جو ہے مقسوم

ہاتھ سے وہ گئی جو سیمیں ساق — ہم رہے سر بہ زانوئے مغموم

صاحِب اپنا ہے بندہ پرور، میر! — ہم جہاں سے نہ جائیں گے محروم

(۸۷)

کیا زمانہ تھا! کہ تھے دِلدار کے یاروں میں ہم — شُہرۂ عالم تھے اُس کے ناز برداروں میں ہم

اُجڑی اُجڑی بستی میں دُنیا کی جی لگتا نہیں — تنگ آئے ہیں بہت اِن چار دیواروں میں ہم

جو بھی ہے غم، الم، رنج و قلق ہجراں کا تو — زِندگی سے بے توقع ہیں اِن آزاروں میں ہم

شاید آوے حال پُرسی کرنے، اِس اُمید پر — کب سے ہیں دارُالشِفا میں، اُس کے بیماروں میں ہم

دھوپ میں جلتے ہیں پھرو، آگے اُس کے میر جی — رنگی سے دِل کی ٹھہرے ہیں گنہ گاروں میں ہم

(۸۸)

سر بے ایسی لگی ہے اب کہ چلے جاتے ہیں — مُتّصِل شمع سے روتے ہیں، گلے جاتے ہیں

تن بدن ہجر میں، کیا کہیے! کہ کیسا سوکھا؟ — ہلکی سی باؤ میں، تنکے سے ہلے جاتے ہیں

رہتے دِکھلائی نہیں دیتے۔ بلاکش اُس کے — جی کھپے جاتے ہیں، دِل اپنے مَلے جاتے ہیں

پھر بخود آئے نہ بدحالی میں، بے خود جو ہوئے — آپ سے جاتے ہیں ہم بھی، تو بھلے جاتے ہیں

خاکِ پا اُس کی ہے شاید، کسو کا سُرمۂ چشم — خاک میں، اہلِ نظر اُس کی سے رُلے جاتے ہیں

گرم ہیں اُس کی طرف جانے کو ہم، لیکن میر!
ہر قدم ضُعفِ محبت سے ڈھلے جاتے ہیں

اُس سے، گھبرا کے جو کچھ کہنے کو آ جاتا ہوں
دل کی پھر دل میں لیے، چُپکا چلا جاتا ہوں

سعیِ دشمن کو نہیں دخل مری ایذا میں
رنج سے عشق کے میں آپ ہی کھپا جاتا ہوں

گرچہ کھویا سا گیا ہوں، پہ ہر حرف و سخن
اُس فریبندۂ عُشّاق کی پا جاتا ہوں

خشم کیوں؟ بے مزگی کاہے کو؟ بے لطفی کیوں؟
بد برا اتنا بھی نہ ہو مجھ سے، بھلا جاتا ہوں

مجلسِ یار میں تو یار نہیں پاتا ہوں
در و دیوار کو احوال سُنا جاتا ہوں

گاہ باشد کہ سمجھ جائے مجھے رفتۂ عشق
دُور سے رنگِ شکستہ کو دِکھا جاتا ہوں

یک بیاباں ہے مِری بے کسی و بے تابی
مثلِ آوازِ جرس، سب سے جُدا جاتا ہوں

گرمیِ عشق ہے ہلکی ابھی ہمدم! دِل میں
روز و شب، شام و سحر میں تو چلا جاتا ہوں

گرمی سے میں تو آتشِ غم کی پگھل گیا
راتوں کو روتے روتے ہی جوں شمع گل گیا

ہم خستہ دِل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے، کہ یاں دم نکل گیا

گرمیِ عشق مانعِ نشو و نُما ہوئی۔
میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

سُنا ہے حال ترے کُشتگاں بچاروں کا
ہُوا نہ گور گڑھا اِن ستم کے ماروں کا

ہزار رنگ کھلے گُل چمن کے ہیں، شاید
کہ روزگار کے سر خون ہے ہزاروں کا

ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم؛ یاں
نکل کے شہر سے، ٹک سیر کر مزاروں کا

سبزانِ تازہ رُو کی جہاں جلوہ گاہ تھی
اب دیکھیے: تو واں نہیں سایہ درخت کا

جوں برگ ہائے لالہ پریشان ہو گیا
مذکور کیا ہے اب جگرِ لخت لخت کا؟

دِلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

دیکھوں میں اپنی آنکھوں سے آوے مجھے قرار — اے اِنتظار! تجھ کو کسی کا ہو اِنتظار
لے پاے خُم کی گردشِ ساغر! ہو دست گیر — مرہونِ دردِ سر ہو کہاں تک مرا خُمار؟
وسعت جہاں کی چھوڑ، جو آرام چاہے میرؔ! — آسودگی رکھے ہے بہت گوشۂ مزار

ہر بحر میں اشعار کہے، عُمر کو کھویا — اُس گوہرِ نایاب کی کچھ بات نہ پائی
دِل اور جِگر جل کے مِرے، دونوں ہُوئے خاک — کیا پُوچھتے ہو! عشق نے کیا آگ لگائی
مجلِس میں مِرے ہوتے، رہا کرتے ہو چُپکے — یہ بات مِری ضد سے تمھیں کِس نے بتائی؟

دِل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے؟ — یہ نگر سَو مرتبہ لوٹا گیا
میرؔ! کِس کو اب دِماغِ گفتگو؟ — عمر گزری، ریختہ چھوٹا گیا

دِل نہ پہُنچا گوشۂ داماں تلک — قطرۂ خوں تھا، مژہ پر جم رہا
میرے رونے کی حقیقت جِس میں تھی — ایک مُدّت تک وہ کاغذ نم رہا

دیکھ تو دِل، کہ جاں سے اُٹھتا ہے — یہ دھُواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے؟
یوں اُٹھے آہ! اُس گلی سے ہم — جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

رُوئے گُل پر روز و شب، کِس شوق سے رہتا ہے باز — رخنۂ دیوار ہے یا دیدۂ نظّارگی
مت فریبِ سادگی کھا اِن سیہ چشموں سے میرؔ! — اِن کی آنکھوں سے ٹپکتی ہے بڑی عیّارگی

مارا تھا کِس لِباس میں عُریانی نے مجھے — جِس سے تہِ زمیں بھی، مَیں بے کفن گیا
سرسبزِ مُلکِ ہند میں ایسا ہُوا کہ میرؔ! — یہ ریختہ لِکھا ہوا تیرا دکن گیا

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر — یہ ہماری زبان ہے پیارے!
میرؔ! عمداً بھی کوئی مرتا ہے؟ — جان ہے، تو جہان ہے پیارے!

یوں بارِ گُل سے اب کے جُھکے ہیں، نہال، باغ
جُھک جُھک کے جیسے کرتے ہیں دو چار یار بات

یوں مُچکے مُچکے، میرؔ! تلف ہوگا کب تلک؟
کُچھ ہو وے، پھر وُ کر اُس سے بھی کر ایک بار بات

دیدنی دشتِ جُنوں ہے کہ پھپھولے پا کے
ہیں نے موتی سے پرو رکھے ہیں ہر خار کے بیچ

توبہ صد بار، کہ مستی میں پرو ڈالے ہیں
دانے تسبیح کے ہیں رِشتۂ زنّار کے بیچ

شش جہت سے اِس میں ظالم! بوئے خوں کی راہ ہے
تیرا کوچہ، ہم سے تو کہہ، کس کی بِسمل گاہ ہے؟

ایک نِبھنے کا نہیں، مژگاں تلک بوجھل ہیں سب
کاروانِ لختِ دِل ہر اشک کے ہمراہ ہے

کِس دِل سے؛ ترا تیرِ نگہ، یار! نہ گزرا
کِس جان کو یہ مرگ کا پیغام نہ آیا؟

نے خوں ہو آنکھوں سے بہا، ٹُک نہ ہُوا داغ
اپنا تو یہ دِل، میرؔ! کسو کام نہ آیا؟

نامُرادانہ زیست کرتا تھا
میرؔ کا طَور یاد ہے ہم کو

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹُک روتے روتے سو گیا ہے

صبح تک شمع سر کو دُھنتی رہی
کیا پتنگے نے اِلتماس کیا؟

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا؟
آن بیٹھے، جو تم نے پیار کیا

تری نا آشنائی کے ہیں بندے
نہ وہ اب ربط، نے صاحِب سلامت

نہ جانا یہ کہ کہتے ہیں کسے پیار؟
رہیں بے لُطفیاں ہی یاں تو باہم

اب کہیں جنگلوں میں ملتے ہیں
حضرتِ خضر مر گئے شاید

گو اُس رُخِ مہتابی سے واں چاندنی چھٹکی — یاں رنگِ شکستہ سے بھی چھُٹتی ہے ہوائی

آنکھوں سے ہوئی خانہ خرابیِ دل، اے کاش! — کر لیتے تبھی بند ہم اِن دونوں دروں کو

جی بھول گیا دیکھ کے وہ چہرہ کتابی — ہم دہر کے علّامہ تھے، پر کچھ نہ رہا یاد

جانی نہ قدر اِس گہرِ شب چراغ کی — دِل ریزۂ خزف کی طرح میں اُٹھا دیا

دیکھ روئے زرد پر میرے بھی آنسو کی ڈھلک — اے، کہ تو نے دیکھی ہے گوہر کی غلطانی بہت

خوب تھے وے دِن کہ ہم تیرے گرفتاروں میں تھے — غم زدوں، اندوہ گینوں، ظُلم کے ماروں میں تھے

ٹپکا کرے ہے آنکھوں سے لوہو ہی روز و شب — چہرے پہ میرے چشم ہے، یا کوئی گھاؤ ہے؟

یاقوت کوئی اُن کو کہے ہے، کوئی گُل برگ — ٹک ہونٹ ہِلا تو بھی، کہ اِک بات ٹھہر جائے

صنّاع ہیں سب خوار، ازاں جملہ ہوں میں بھی — ہے عیب بڑا اُس میں، جسے کچھ ہنر آوے

رات مجلس میں تِری ہم بھی کھڑے تھے چُپکے — جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

حیرت سے ہووے پرتوِ مہ، نُورِ آئینہ — تو چاندنی میں نکلے اگر، ہو سفید پوش

بوئے خوں آتی ہے بادِ صبح گاہی سے مجھے — نکلی ہے بے درد شاید ہو کسی گھائل کے پاس

اِس قیدِ جیب سے میں چھوٹا جنوں کی دولت — ورنہ گلا یہ میرا، جوں طوق میں پھنسا تھا

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورشِ کیفیّت و معنی — گیا ہو میر دیوانہ، رہا سودا سو مستانہ

لہو لگتا ہے ٹپکنے، جو پلک ماروں ہوں — اب تو یہ رنگ ہے اِس دیدۂ اشک افشاں کا

ہے کون آپ میں؟ جو ملے تجھ سے، مستِ ناز!
ذوقِ خبر ہی یاں تو ہمیں بے خبر کیا

گلی میں اُس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر
میں میرؔ میرؔ! کر اُس کو بہت پُکار آیا

رہے خیال تنک ہم بھی رو سیاہوں کا
لگے ہو خون بہت کرنے بے گناہوں کا

داغِ فراق، حسرتِ وصل، آرزوئے شوق
میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا

دعویٰ کیا تھا گل نے، ترے رُخ سے باغ میں
سیلی لگی صبا کی، تو منھ لال ہو گیا

ہم ہوئے، تم ہوئے، کہ میرؔ ہوئے
اُن کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

آتے ہیں مُتّصِل چلے آنسو
آہ! کب تک یہ آنسو رو لو تم؟

آج کچھ بے حجاب ہے وہ بھی
کیا ہی مستِ شراب ہے وہ بھی؟

مصائب اور تھے، پر دل کا جانا
عجب اِک سانحہ سا ہو گیا ہے

ناسخ - امام بخش

ولادت ۷ر محرم ۱۱۸۶ھ/ ۱۰ر اپریل ۱۷۷۲ء
وفات ۲۴ر جمادی الاول ۱۲۵۴ھ/ ۱۶ر اگست ۱۸۳۸ء

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا — طلوعِ صبحِ محشر، چاک ہے میرے گریباں کا
کسی خورشید رُو کو آج جذبِ دل نے کھینچا ہے — کہ نورِ صبحِ صادق ہے، غبار اپنے بیاباں کا
ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں — دلِ پُر داغ کو کیوں کر ہے عشق اُس مارِ پیچاں کا؟
شگفتہ مثلِ گل، ہر فصلِ گل میں، داغ ہوتے ہیں — بنا ہے کیا ہمارا کالبد خاکِ گلستاں کا؟
سیہ خانہ مرا روشن ہوا، ویراں ہونے سے — کیا دیوار کے رخنوں نے یاں عالم چراغاں کا
وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی خاطر میں سمایا ہے — کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا

(۲)

کوئی غارت گر نہیں، دیوانوں کے اسباب کا — خانۂ زنجیر کو کچھ غم نہیں سیلاب کا
ساقیا! لا جامِ مے، درپیش ہے جنگِ سخن — ہے بجا تیغِ زباں پر آج ہونا آب کا
پاک طینت جو کہ ہیں، اُن سے تعلق دور ہے — خار سے کیا اُلجھے، گوشہ چادرِ مہتاب کا
ہے یہی خورشید کا رتبہ حضورِ پیشِ یار — سامنے خورشید کے رتبہ جو ہے مہتاب کا
جورِ اعدا پر بھی کر سکتا نہیں ترکِ وطن — دھیان آتا ہے جو ناسخ! فرقتِ احباب کا

(۳)

رات بھر جو سامنے آنکھوں کے وہ مہ پارہ تھا — غیرتِ مہتاب اپنا دامنِ نظّارہ تھا
تو نے آنکھیں پھیر لیں، یاں کام آخر ہو گیا — طائرِ جاں پائے بندِ رشتۂ نظّارہ تھا
شب ترے پرتو سے لبریزِ لطافت تھا چمن — ہر گلِ شبّو سے جاری نور کا فوّارہ تھا
خرّمی ہوتی ہے بے دردوں کو سیرِ باغ میں — ہم نے جس گُل پر نظر کی، اک دلِ صد پارہ تھا
اے اجل! دی تو نے بارِ جسم سے آکر نجات — کب سے میری پیٹھ پر یہ خاک کا پشتارہ تھا
خوف سب جاتا رہا دل سے عذابِ ہجر کا — نقدِ جاں دینا، گناہِ عشق کا کفّارہ تھا
کہتے ہیں مارا گیا بے جرم تیغِ ناز سے — کوچۂ قاتل میں ناسخ نام جو بے چارہ تھا

(۴)

لب ریز اُس کے ہاتھ سے ساغر شراب کا
بنتا ہے عکسِ رُخ سے کٹورا گلاب کا

ہر ہر قدم پہ پھوٹتے جاتے ہیں آبلے
نقشِ قدم ہیں طور ہے چشمِ پُر آب کا

کہتے ہیں، تیرے عارض و قامت کو دیکھ کر
بالائے سرو پھول کھلا ہے گلاب کا

جو ہر ہیں برگِ گُل ترے چہرے کے عکس سے
بن جائے کیوں نہ آئینہ، تختہ گلاب کا؟

صبحِ فراق میں ہوئی قدر شبِ وصال
آیا ہے یاد پیری میں عالم شباب کا

(۵)

جب سے کہ بُتوں سے آشنا ہوں
بیگانہ، خدائی سے ہُوا ہوں

بیگانہ ہوں کیوں کہ آشنا سے
بیگانوں سے بھی میں آشنا ہوں

منہ اُن کا نہیں ہے، شکر، ورنہ
ہر بُت کہتا، کہ میں خدا ہوں

اُمیدِ وصال، اب کہاں ہے؟
اُس گُل سے بہ رنگِ بو جدا ہوں

تو رنگِ چمن، میں ہوشِ بلبل
تو نکہتِ گُل، تو میں صبا ہوں

آئینۂ دل میں ہے ترا عکس
دن رات میں تجھ کو دیکھتا ہوں

(۶)

دل میں پوشیدہ تپِ عشقِ بُتاں رکھتے ہیں
آگ ہم سنگ کی مانند نہاں رکھتے ہیں

بزمِ جاناں میں کبھی بات نہ نکلی منھ سے
کہنے کو شمع کی مانند زباں رکھتے ہیں

شکلِ پروانہ نہیں کچھ زر و مال اپنے پاس
ہم فقط تجھ پہ فدا کرنے کو جاں رکھتے ہیں

تازگی ہے سخنِ کہنہ میں یہ بعدِ وفات
لوگ اکثر مرے جینے کا گماں رکھتے ہیں

(۷)

ہر بگولے میں عیاں اک لغزشِ مستانہ ہے
گردشِ چشمِ غزالاں، گردشِ پیمانہ ہے

ابر ہے، صحنِ چمن ہے، ساقیِ مستانہ ہے
ہر طرف کو خندۂ برق و گُل و پیمانہ ہے

پانو میں کانٹے چبھے ہیں، پیرہن ہے چاک چاک
باغ میں جو گُل ہے، تیرے عشق میں دیوانہ ہے

اپنے کاموں میں رہو مشغول تم اے غافلو!   اِس کی باتوں پر نہ جاؤ، ناسخ اِک دیوانہ ہے

(۸)

آپ میں آئیں، جائیں یار کے پاس   کب سے ہے ہم کو اِنتظار اپنا
بے خودی میں یہ کون یاد آیا؟   خود بہ خود دِل ہے بے قرار اپنا
بعد مرنے کے آج اے ناسخ!   عزم ہے سوئے کوئے یار اپنا
آگے آگے ہوئی ہے رُوح رواں   پیچھے پیچھے چلا غبار اپنا

جو دِل ہی ٹوٹ گیا، کیا ہوں شعر تر پیدا   ہوئے ہیں شاخِ شکستہ سے کب ثمر پیدا؟
شگفتہ غنچہ نہ جب تک ہو، بو نہیں آتی   ہو چاک چاک اگر دِل، تو ہو اثر پیدا
پناہ ملتی ہے خلقت کو، مرگِ ظالم سے   جو کر گدن کو کریں قتل، ہو سپر پیدا

معطّر اُس کے نہانے سے بس کہ آب ہوا   حبابِ بحر ہر اِک شیشۂ گُلاب ہوا
جو یاد بزم میں آئی وہ نرگسِ مے گوں   نظر میں ساغرِ مے، دیدۂ پُر آب ہوا
نگہ ٹھہرتی نہیں اپنے عکس پر اُس کی   شعاعِ حُسن سے، آئینہ، آفتاب ہوا

کیا پڑ گیا ہے عکس، تری چشمِ مست کا   نرگس کی شاخ بن گئی ہر موج آب میں
ساغر میں عکسِ رُخ، رُخِ گلگوں پہ ہے عرق   موتی جو آگ میں ہے تو شعلہ ہے آب میں
مستوں کا عیش تلخ ہے دیرِ خراب میں   یہ رمز ہے، جو ہوتی ہے تلخی شراب میں

ہوئی اِس بزم میں بے طور زباں جس کی دراز   شمع کی طرح سے سر کٹنے میں تاخیر نہیں
قاصدا! حالِ سراپا ہے، سراپا مرقوم   اپنا مکتوب، کم از کاغذِ تصویر نہیں
شبہ ناسخ! نہیں کچھ میر کی اُستادی میں   آپ بے بہرہ ہے، جو معتقدِ میر نہیں

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں، وہاں آسماں نہیں

دو روز ایک وضع پہ رنگِ جہاں نہیں
وہ کون سا چمن ہے، کہ جس کو خزاں نہیں

آنکھوں سے فائدہ؟ جو نہیں تیری گردِ راہ
حاصل جبیں سے کیا؟ جو ترا آستاں نہیں

لالہ و گل کا جوش ہے، بلبلوں کا خروش ہے
فصلِ وداعِ ہوش ہے، موسمِ ناو نوش ہے

صدقے ہو تیری چال پر، کیوں نہ نسیم ہر سحر
نقشِ قدم سے رہ گزر، دامنِ گل فروش ہے

ذکرِ نزاکتِ بتاں، ہے جو چمن کے درمیاں
موجِ نسیم بے زباں، گل، سو بہ رنگِ گوش ہے

تمام عمر یونہی ہو گئی بسر اپنی
شبِ فراق گئی، روزِ انتظار آیا

خبر کرے کوئی زاہد کو، آئے بہرِ مدد
شکستِ توبہ کو، پھر موسمِ بہار آیا

چاک کرنے کے لیے، اے ناصح!
ہم گریباں سیا کرتے ہیں

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

رشک سے لیتے نہیں نام، کہ سن لے نہ کوئی
دل ہی دل میں، اُسے ہم یاد کیا کرتے ہیں

انتقام اُس کا کہیں لے نہ فلک، ڈرتا ہوں
جھوٹے وعدوں سے جو وہ شاد کیا کرتے ہیں

یہ زمیں ہے بے وفا، یہ آسماں بے مہر ہے
جی میں ہے اب اِک نیا عالم کریں ایجاد ہم

روک لے اِک بات کی بات اپنے دستِ تیغ کو
دے لیں اے قاتل! رقیبوں کو مبارک باد ہم

پہلے اپنے عہد سے افسوس سودا اُٹھ گیا
کس سے مانگیں، جا کے ناسخ! اِس غزل کی داد ہم

نہیں ہے مُعتقد میرا، اگر حاسد، تو کیا غم ہے؟ ہُوا، بے سجدۂ ابلیس، کیا نقصان آدم کا؟
سخاوت جس کو کہتے ہیں، کہانی ہے زمانے میں بخیلوں کی بدولت رہ گیا ہے نام حاتم کا

موت نے، تیغِ زبانِ خلق سے دی ہے نجات کہتے ہیں جس کو کفن، وہ مجھ کو جوشن ہو گیا
گر قناعت ہو، تو نانِ خشک ہے نعمت بڑا! دیکھ لے، پانی، چراغِ گُل کو روغن ہو گیا

چوٹ دِل کو جو لگے، آہِ رسا پیدا ہو صدمہ شیشے کو جو پہنچے، تو صدا پیدا ہو
گُل تجھے دیکھ کے گلشن میں کہیں، عُمر دراز شاخ کے بدلے وہاں ہی دستِ دُعا پیدا ہو

پس از فنا بھی کسی طور سے قرار نہیں ملا بہشت، تو کہتا ہوں، کوئے یار نہیں
ہماری جامہ دری میں ہے گُل کی کب تقلید؟ یہ وہ جنوں ہے، کہ وابستۂ بہار نہیں

تقلید سے ہُوا شرفِ ذات کب حصُول؟ آئینہ ساز، مثلِ سکندر نہ ہو سکے
رکھو کسی طرح تو سروکار، مہرباں! کرتے رہو، جفا ہی، وفا گر نہ ہو سکے

یوں نزاکت سے گراں ہے سُرمہ چشمِ یار کو جس طرح ہو رات بھاری، مردمِ بیمار کو
خاکسارانِ جہاں کا ہے ادب ایسا مجھے پانو رکھتا ہوں بچا کر سایۂ دیوار کو

مار ڈالا بات میں، ٹھوکر سے زندہ کر دیا سحر ہے گفتار میں، اعجاز ہے رفتار میں
رسمِ مُلکِ حُسن یہ ہے، گُل فروشوں کی طرح داغِ سودا بیچتے ہیں لالہ رُو بازار میں
آفتابِ حشر بھی مُجھ کو بچا کر جائے گا رونے والا ہوں کسی کے سایۂ دیوار میں

مرتبہ کم حرص و رفعت سے ہمارا ہو گیا   آفتاب اونچا ہوا ایسا کہ تارا ہو گیا

خاکِ صحرا چھانتا پھرتا ہوں اِس غربال میں   آبلوں میں کر دیے کانٹوں نے روزن زیرِ پا

رکھتا ہے فلک سر پہ، بنا کر شفق اُس کو   اُڑتا ہے اگر رنگِ حنا تیرے قدم سے

دیکھتے ہی اُڑتے ہیں اطرافِ جہاں میں اپنے شعر   طائرِ معنی کو کاغذ، شہپرِ پرواز ہے

مے کشی کے باب میں، ناسخ! جنابِ درد سے   سُن لے مصرع، جب تک بس چل سکے، ساغر چلے

حاضر ہے قتل ہونے کو ناسخ بھی مثلِ درد   گر نام عاشقی ترے نزدیک ننگ ہے

دِگر گوں ہے ہر آن وضعِ محبت   کبھی غیر میں ہوں، کبھی یار میں ہوں

عشق تو مُدت سے اے ناسخ! نہیں   مجھ کو اپنی بات کا اب پاس ہے

کب سے ناسخ کی جستجو تھی مجھے   آج وہ خانماں خراب ملا

میں خوب سمجھتا ہوں، مگر دل سے ہوں ناچار   اے ناصحو! بے فائدہ سمجھاتے ہو مجھ کو

ہر گلی میں ہیں سائلِ دیدار   آنکھ یاں کاسۂ گدائی ہے

دَیر ویراں ہے ترے عہد میں، کعبہ ہے خراب   جمع ہیں کافر و دیں دار ترے کوچے میں

ہے عجب رنگ کی وحشت ترے دیوانے میں   جی نہ آبادی میں لگتا ہے، نہ ویرانے میں

سَو رمز کی کرتا ہے اشارے میں وہ باتیں   ہے لطف خموشی میں تکلّم سے زیادہ

میں ہی اے ناسخ! نہیں کچھ طالبِ دیوانِ میر   کون ہے؛ جس کو کلامِ میر کی حاجت نہیں

ناسخ! ہے میر سلّمہ اللہ کی زمیں اِک معنیِ شگفتہ کو باندھا ہزار رنگ

وہ نہیں بھولتا، جہاں جاؤں ہائے! میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟

جی اڑا دیتا ہے، کیسی ہو زمینِ سنگلاخ خامہ تیشہ ہے تو ناسخ کوہ کن سے کم نہیں

کب ہماری فکر سے سودا کا ہوتا ہے جواب؟ ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ! ہم اُس مغفور کا

اے اجل! ایک دن آخر تجھے آنا ہے، ولے آج آتی شبِ فرقت میں، تو احساں ہوتا

مانعِ صحرا نوردی پانو کی ایذا نہیں دِل دُکھا دیتا ہے میرا، ٹوٹ جانا خار کا

خواب ہی میں نظر آتا وہ شبِ ہجر کہیں سو مجھے حسرتِ دیدار نے سونے نہ دیا

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں

آگے وحشت شہر سے تھی، اب ہے دُنیا سے گریز تھا وہ آغازِ جنونِ عشق، یہ انجام ہے

کسی کا کب کوئی روزِ سیہ میں ساتھ دیتا ہے؟ کہ تاریکی میں سایہ بھی جُدا رہتا ہے اِنساں سے

بے مسرت راحتِ دُنیا ہے، غفلت کے سبب کون خوش ہوتا ہے بیداری میں عیشِ خواب سے

ہر روز روزِ ہجر ہے، ہر شب شبِ فراق نفرت ہوئی یہاں کے سفید و سیاہ سے

ہجرِ جاناں سے رہائی کا قرینا ہو گیا سہل مرنا ہو گیا، دُشوار جینا ہو گیا

مے کدے تک محتسب کو میکشو! آنے تو دو دیکھ کر پیمانے کو پیماں شکن ہو جائے گا

دہلی کا نام بھی اِک شہر میں سنتے نہیں کیوں نہ ہوں سب لکھنؤ کے کوچہ و بازار رنج؟

آتش - خواجہ حیدر علی

ولادت تخمیناً ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء
وفات ۲۵ محرم ۱۲۶۳ھ/۱۳ جنوری ۱۸۴۷ء

غیرتِ مہر، رشکِ ماہ ہو تم — خوب صورت ہو، بادشاہ ہو تم
کیوں کر آنکھیں نہ ہم کو دکھلاؤ؟ — کیسے خوش چشم، خوش نگاہ ہو تم؟
حسن میں آپ کے ہے شانِ خدا — عشق بازوں کی سجدہ گاہ ہو تم
کیوں محبت بڑھائی تھی تم سے؟ — ہم گنہ گار، بے گناہ ہو تم
ہر لباس آپ کو ہے زیبندہ — جامہ زیبی کے بادشاہ ہو تم

(۲)

عشق کے سودے سے پہلے، دردِ سر کوئی نہ تھا — داغِ دل خندہ زنِ زخمِ جگر کوئی نہ تھا
غیرِ یار، آنکھوں میں اپنی جلوہ گر کوئی نہ تھا — محفلِ شب میں سے ہنگامِ سحر کوئی نہ تھا
عہدِ پیری میں، جوانی تھی، نہ اُس کے ولولے — مردمانِ چشم سا، اہلِ نظر کوئی نہ تھا
معرکہ میں عشق کے، سر ہاتھ پر رکھے ہوئے — واپسیں دم تک، تو مجھ سے پیش تر کوئی نہ تھا
لے چلے ہستی سے داغِ عشق آتش، شکر ہے — منزلِ مُلکِ عدم کا ہم سفر کوئی نہ تھا

(۳)

نکلتی کس طرح ہے جانِ مضطر، دیکھتے جاؤ! — ہمارے پاس سے جاؤ، تو پھر کر دیکھتے جاؤ!
نسیمِ نوبہاری کی طرح آئے ہو گلشن میں — تماشائے گل و سرو و صنوبر دیکھتے جاؤ!
جدھر جاتے ہو، ہر گھر میں سے یہ آواز آتی ہے — مسیحا ہو جو بیماروں کو دم بھر دیکھتے جاؤ!
روش مستانہ چلتے ہو، قدم مستانہ پڑتے ہیں — خدا کے واسطے، بہرِ پیمبر دیکھتے جاؤ!
نقابِ اک رزن الٹ کر تم نے یہ منھ سے نہ فرمایا — جمالِ آفتابِ ذرّہ پرور، دیکھتے جاؤ!

(۴)

سن تو سہی! جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟ — کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟
چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر — دل صاف ہو ترا، تو ہے آئینہ خانہ کیا؟

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے، نہ مُلک و مال / ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟

آتی ہے کس طرح سے؟ مری قبضِ روح کو / دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا؟

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے / آتش! غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا؟

(۵)

تار تارِ پیرہن میں بس گئی ہے بوئے دوست / مثلِ تصویرِ نہالی میں ہوں، یا پہلوئے دوست

ہجر کی شب ہو چکی روزِ قیامت سے دراز / دوش سے نیچے نہیں اُترے ابھی گیسوئے دوست

فرشِ گل بستر تھا اپنا، سوتے ہیں اب خاک پر / خشت زیرِ سر نہیں، یا تکیہ تھا زانوئے دوست

یاد کر کے اپنی بربادی کو، رو دیتے ہیں ہم / جب اُڑاتی ہے ہوائے تند خاکِ کوئے دوست

اُس بلائے جاں سے آتش! دیکھیے کیوں کر نبھے؟ / دل سوا شیشے سے نازک، دل سے نازک خوئے دوست

(٦)

تصوّر سے کسی کے، میں نے کی ہے گفتگو برسوں / رہی ہے ایک تصویرِ خیالی روبرو برسوں

ہُوا مہمان آکر، رات بھر وہ شمع رو برسوں / رہا روشن مرے گھر کا چراغِ آرزو برسوں

چمن میں جا کے بھولے سے میں خستہ دل کراہا تھا / کیا کی گُل سے بُلبل شکوۂ دردِ گلو برسوں

برابر جان کے رکھا ہے اُس کو مرتے مرتے تک / ہماری قبر پر رویا کرے گی آرزو برسوں

دیا ہے حکم، تب پیرِ مغاں نے سجدۂ خُم کا / کیا ہے جب شرابِ ناب سے ہم نے وضو برسوں

اگر میں خاک بھی ہوں گا تو آتش! گرد باد آسا / رکھے گی مجھ کو سرگشتہ کسی کی جستجو برسوں

(۷)

مگر اُس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے / اُلٹتی ہیں صفیں، گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی / گریباں پھاڑتا ہے، تنگ جب دیوانہ آتا ہے

فراقِ یار میں، دل پر نہیں معلوم کیا گزری؟ / جو اشک آتا ہے آنکھوں میں، سو بیتابانہ آتا ہے

تماشا گاہ ہستی میں، عدم کا دھیان ہے کس کو؟ / کسے اس انجمن میں یادِ خلوت خانہ آتا ہے؟

زیارت ہوگی کعبہ کی، یہی تعبیر ہے اس کی / کئی شب سے، ہمارے خواب میں بُت خانہ آتا ہے

عتاب و لطف جو فرماؤ ہر صورت سے راضی ہیں
شکایت سے نہیں واقف، ہمیں شکرانہ آتا ہے

خدا کا گھر ہے، بت خانہ ہمارا دل نہیں آتش!
مقامِ آشنا ہے، یاں نہیں بیگانہ آتا ہے

(۸)

دہن پر ہیں اُن کے، گماں کیسے کیسے؛
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے؛

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا؛
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے؛

نہ گورِ سکندر، نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے؛

دل و دیدۂ اہلِ عالم میں گھر ہے
تمہارے لیے ہیں مکاں کیسے کیسے؛

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے؛

(۹)

یہ آرزو تھی، تجھے گل کے رُو برُو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

پیامبر نہ میسر ہوا، تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے؟

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی، آزاد آرزو کرتے

وہ جانِ جاں نہیں آتا، تو موت ہی آتی
دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے؟

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی، آتش!
برستی آگ، جو باراں کی آرزو کرتے

(۱۰)

گدا نواز، کوئی شہ سوار راہ میں ہے
بلند آج نہایت، غبار راہ میں ہے

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر، ہستی میں
نہ کوئی شہر، نہ کوئی دیار راہ میں ہے

سمندِ عمر کو اللہ رے! شوقِ آسائش
عنان گسستہ و بے اختیار راہ میں ہے

جنوں میں، خاک اڑاتا ہے ساتھ ساتھ اپنے
شریکِ حال ہمارا غبار راہ میں ہے

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

(۱۱)

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے، نغمہ ساز کا
شبہ ہو جاتا ہے، پردے سے تری آواز کا

یہ اشارہ ہم سے ہے۔ اُن کی نگاہِ ناز کا
دیکھ لو یا تیرِ قضا ہوتا ہے اِس انداز کا

روح، قالب سے جدا کرتا ہے، قالب، روح کو
ایک ادنا سا کرشمہ ہے یہ تیرے ناز کا

سُرمہ ہو جاتا ہے جل کر، آتشِ سودا سے، یار!
دیکھنے والا تری چشمِ فسوں پرداز کا

حیرت آنکھوں کو ہے۔ نظارہ میں اُس محبوب کے
یہ نہیں کھلتا، کہ دِل کُشتہ ہے کِس انداز کا؟

بندشِ الفاظ، جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش! مرصّع ساز کا

(۱۲)

فصلِ گُل ہے، لوٹیے کیفیتِ مے خانہ آج
دولتِ ساقی سے مالا مال ہے، پیمانہ آج

بادشاہِ وقت ہے، اپنا دِلِ دیوانہ آج
داغِ سودا، ہم کو دیتا ہے جنوں نذرانہ آج

مجھ سے دریا نوش کو ساقی پلاتا ہے شراب
دیکھتا ہوں میں بھی ظرفِ شیشہ و پیمانہ آج

دیکھوں تو کیوں کر پری ہوتی نہیں شیشے میں بند؟
بعدِ مدت ہوش میں، آیا ہوں میں دیوانہ آج

نزع کی مشکل بھی آساں ہوتی ہے، آتش! نہ ڈر!
شاہِ مرداں سے طلب کر ہمتِ مردانہ آج

(۱۳)

چمن میں رہنے دے کون آشیاں؟ نہیں معلوم
نہال کس کو کرے باغباں؟ نہیں معلوم

کیا ہے کس نے طریقِ سلوک سے آگاہ؟
مُرید کس کا ہے پیرِ مغاں؟ نہیں معلوم

اخیر ہو گئے غفلت میں دن جوانی کے
بہارِ عمر ہوئی کب خزاں؟ نہیں معلوم

یہ اشتیاقِ شہادت میں محو تھا دمِ قتل
لگے تھے زخم بدن پر کہاں؟ نہیں معلوم

جہان و کارِ جہاں سے ہوں بے خبر، میں مست
زمیں کدھر ہے؟ کہاں آسماں؟ نہیں معلوم

سپرد کس کو مرے بعد ہو امانتِ عشق
اٹھائے کون یہ بارِ گراں؟ نہیں معلوم

کس آئنے میں نہیں جلوہ گر تری تمثال؟
مجھے سمجھتے ہیں ہم، این و آں نہیں معلوم

(۱۴)

وحشی تھے بوئے گُل کی طرح سے جہاں میں ہم
نکلے، تو پھر کے آئے نہ اپنے مکاں میں ہم

ساقی ہے، یارِ ماہ لقا ہے، شراب ہے
اب بادشاہِ وقت ہیں، اپنے مکاں میں ہم

کیا حال ہے؟ کسی نے نہ پوچھا، ہزار حیف!
نالاں رہے، جرس کی طرح، کارواں میں ہم

شاگردِ طرزِ خندہ زنی میں ہے گُل ترا
اُستادِ عندلیب ہیں، شور و فُغاں میں ہم

دُنیا و آخرت میں طلب گار ہیں ترے
حاصل تُجھے سمجھتے ہیں دونوں جہاں میں ہم

آتش! سخن کی قدر زمانے سے اُٹھ گئی
مقدور ہو تو قُفل لگائیں زباں میں ہم

(۱۵)

گیسوؤں کا ترے سودا، شُعرا رکھتے ہیں
یہی باعث ہے، جو یہ فکرِ رسا رکھتے ہیں

خون سے پارۂ دِل پر، نہیں اب عشق کا داغ
یہ نگیں وہ ہیں، کہ جو نقشِ وفا رکھتے ہیں

مُحتسب! عقل جو رکھتا ہے تو خُم خانے جا!
شیشہ و جام، مے ہوش رُبا رکھتے ہیں

سچ تو یہ ہے کہ نہیں دوسرا تجھ سا کوئی
اے صنم! جھوٹ نہ بولیں گے، خُدا رکھتے ہیں

بحرِ اُلفت میں تباہی کا ہے اندیشہ کسے؟
ناخُدا جو نہیں رکھتے، وہ خُدا رکھتے ہیں

(۱۶)

تصویر کھینچی، اُس نے رُخِ سُرخ فام کی
اِک صفحے میں قلم نے، گُلستاں تمام کی

اللہ رے! تکلّفِ ساقی بہار میں
مے کی گُلابیاں ہیں، مرصّع کے کام کی

کیا اپنی انجُمن میں صبا کو میں راہ دوں؟
کلیوں میں بوئے خلوتِ خاص، اُس نے عام کی

حُجّت ہے بہرِ مذہبِ عشق ایک ایک داغ
سینہ مرا کتاب ہے علمِ کلام کی

اندیشۂ بہار سے رنگِ خزاں ہے زرد
ہشت لگی ہوا ہے اُسے اِنتقام کی

آتش! خُدا کے واسطے موقوف فکرِ شعر
طاقت نہیں دِماغ کو نظمِ کلام کی

(۲)

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اِس قطرے کو دریا کی جُدائی کا

ہوئی منظور محتاجی نہ تجھ کو اپنے سائل کی
بنایا کاسۂ سر واژگوں کاسہ گدائی کا

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو
کوئی، آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا

نکل اے جان! تن سے، تا وصالِ یار حاصل ہو
چمن کی سیر ہے انجام بلبل کو رہائی کا

شکستِ خاطرِ احباب ہوتی ہے درست اس سے
توجہ میں تری اے یار! اثر ہے مومیائی کا

دل اپنا آئینے سے صاف، عشقِ پاک رکھتا ہے
تماشا دیکھتا ہے حسن اس میں خود نمائی کا

نہیں دیکھا ہے لیکن تجھ کو پہچانا ہے آتش نے
بجا ہے اے صنم! جو تجھ کو دعویٰ ہو خدائی کا

(۱۸)

فریبِ حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ، بت سے برہمن بگڑا

تکلف کیا؛ جو کھوئی جانِ شیریں پھوڑ کر سر کو
جو غیرت تھی، تو پھر خسرو سے ہوتا کوہکن بگڑا

تری تقلید سے کبکِ دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال، اس کا چلن بگڑا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا، نہ اک تارِ کفن بگڑا

لگے منھ بھی چڑھانے، دیتے دیتے گالیاں صاحب!
زباں تو خیر بگڑی ہی تھی، خبر لیجے! دہن بگڑا

(۱۹)

سوادِ گیسوئے مشکیں میں ظلمت شام کی پائی
بیاضِ گردنِ محبوب میں، نورِ سحر دیکھا

مسافر ہی نظر آیا، نظر آیا جو دنیا میں
جسے دیکھا، اسے آلودۂ گردِ سفر دیکھا

خریدارِ محبت آئے بھی بازارِ عالم میں
وہی سودا کیا ہم نے، کہ جس میں دردِ سر دیکھا

فراقِ یار میں جب عشق نے تجھ کو ٹٹولا ہے
جو دل فولاد کا پایا، تو پتھر کا جگر دیکھا

(۲۰)

شبِ وصل تھی، چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا، خدا مہرباں تھا

مبارک شبِ قدر سے بھی وہ شب تھی
سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا

حضوری نگاہوں کو دیدار سے تھی
کھلا تھا وہ پردہ، کہ جو درمیاں تھا

حقیقت دکھاتا تھا عشقِ مجازی
نہاں جس کو سمجھے ہوئے تھے، عیاں تھا

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے — یہ قصہ ہے جب کا، کہ آتش جواں تھا

(۲۱)

حسن کے نظارے سے ہوتی ہے کیفیت وصول — عشق رکھتا ہے ہمیں سب بادۂ گلنار مست
کون پوجے بت کو، کس سے ہو سکے یادِ خدا — اپنے اپنے حال میں ہیں کافر و دیں دار مست
مے کدے میں نشہ کی عظمت دکھاتی ہے مجھے — آسماں مست و زمیں مست و در و دیوار مست
زاہدوں کی پنج گانہ سے فضیلت ہے اُسے — نشہ کے عالم میں جو کرتے ہیں استغفار، مست
خارخارِ دل کہے کس سے، ہے سنے بلبل کی کون؟ — باغباں مست و صبا مست و گل و گلزار مست

(۲۲)

جلا میں شمع کی مانند عمر بھر، خاموش — تمام عمر کٹی، قصہ مختصر، خاموش
نہیں قرار زمانے کو ایک حالت پر — جو دوپہر ہوں میں نالاں، تو دوپہر خاموش
جنوں میں بھی ہوئی زائل نہ مجھ سے دانائی — رہا میں عالمِ وحشت میں بیشتر خاموش
نہ کعبے میں نظر آیا نہ بت کدے میں تو — اٹھا میں بیٹھ کے اک دم اِدھر اُدھر خاموش
ہوئی ہے قائلِ عالم، صباحتِ رخِ یار — چراغِ زیست کو بھی کرتی ہے سحر خاموش

(۲۳)

خوشا وہ دل! کہ ہے جس میں آرزو تیری — خوشا دماغ، جسے تازہ رکھے بو تیری
پڑھا ہے ہم نے بھی قرآں، قسم ہے قرآں کی — جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری
شبِ فراق میں لے روزِ وصل! تا دمِ صبح — چراغ ہاتھ میں ہے اور جستجو تیری
جو ابرِ گریہ زناں ہے، تو برق خندہ زناں — کسی میں خو ہے ہماری، کسی میں خو تیری
زمانہ میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیفِ زباں — رہے گی معرکہ میں آتش! آبرو تیری

(۲۴)

حسرتِ جلوۂ دیدار لیے پھرتی ہے — پیشِ روزن، پسِ دیوار لیے پھرتی ہے
اس مشقت سے اُسے خاک نہ ہوگا حاصل — جاں، عبث جسم کی بیگار لیے پھرتی ہے

حالِ مفلس مجھے سمجھا ہے جنوں نے شاید
وحشتِ دل، سرِ بازار لیے پھرتی ہے

دریار آئے، ٹھکانے لگے مٹی میری
دوش پر اپنے صبا بار لیے پھرتی ہے

سایۂ حُسن کے ہمراہ ہے عشقِ بیباک
ساتھ یہ جنس، خریدار لیے پھرتی ہے

کسی صورت سے نہیں جاں کو قرار، اے آتش!
تپشِ دل مجھے لاچار لیے پھرتی ہے

(۲۵)

سر شمع ساں کٹائیے، پر دم نہ ماریے
منزل ہزار سخت ہو، ہمت نہ ہاریے

مقسوم کا جو ہے، سو وہ پہنچے گا آپ سے
پھیلائیے نہ ہاتھ، نہ دامن پساریے

طالب کو اپنے رکھتی ہے دُنیا ذلیل و خوار
زر کی طمع سے چھانتے ہیں خاک نیاریے

تنہائی ہے، غریبی ہے، صحرا ہے، خار ہے
کون آشنائے حال ہے؟ کس کو پکاریے؟

تم فاتحہ بھی پڑھ چکے، ہم دفن بھی ہوئے
بس خاک میں ملا چکے، چلیے، سدھاریے!

نازک دلوں کو شرط ہے آتش! خیالِ یار
شیشہ خدا جو دے، تو پری کو اُتاریے

(۲۶)

سر میں ہوائے کوچۂ دلدار لے چلے
باغِ جہاں سے حسرتِ گلزار لے چلے

مقصودِ دل ہے قلزمِ خوں میں شناوری
جس گھاٹ چاہے، یار کی تلوار لے چلے

ایسی رسائی کیجیے پیدا کہ کھینچ کر
خلوت میں انجمن سے، ہمیں یار لے چلے

داغِ فراق و حسرتِ دیدار و شوقِ وصل
دُنیا سے ہم یہ عاقبتِ کار لے چلے

تم سیر کر کے کیا پھرے؟ اندھیر ہو گیا
بازار آ کے، رونقِ بازار لے چلے

حاصل ہوا نہ خاک بھی، آپس کی نزع سے
دل میں غبار، کافر و دیں دار لے چلے

آتش! جرس کے نالوں کی پھر ہو نہ احتیاج
ہم کو جو ساتھ قافلہ سالار لے چلے

بلند خاک نشینی نے قدر کی میری
عروج مجھ کو ہوا، جب کہ پائمال ہوا

دکھا کے چہرۂ روشن، وہ کہتے ہیں سرِ شام
وہ آفتاب نہیں ہے جسے زوال ہوا

پُشت بر دیوار صورت ہیں ہزاروں صورتیں
صاحبِ آئینہ خانہ آج تک خاموش ہے

اہلِ دُنیا حالِ ہم دیگر سے کیا ہوں مُطّلع ؟
مجلسِ تصویر میں کِس کو کِسی کا ہوش ہے ؟

گُل ہراک ساغر بہ کف، بُلبُل ہراک نغمہ طراز
سَیرِ باغ آتشؔ! مجھے ایماے نادنوش ہے

تری زُلفوں نے بل کھایا تو ہوتا
ذرا سُنبل کو لہرایا تو ہوتا

چلے گا کبک کیا رفتار تیری ؟
یہ اندازِ قدم پایا تو ہوتا

کہے جاتے، وہ سُنتے یا نہ سُنتے
زباں تک حالِ دِل آیا تو ہوتا

سمجھتا، یا نہ اے آتشؔ! سمجھتا
دلِ مُضطر کو سمجھایا تو ہوتا

سِواے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اِس زمانے میں
غنیمت جان! جو آرام تو نے کوئی دم پایا

نظر آیا تماشاے جہاں، جب بند کیں آنکھیں
صفاے قلب سے پہلو میں ہم نے جامِ جم پایا

غرورِ عشق زِیادہ غرورِ حُسن سے ہے
اِدھر تو آنکھ پھری، دم اُدھر روانہ ہُوا

نہ پُوچھ حال مِرا، چوبِ خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے، کارواں روانہ ہُوا

ہوگیا سِلسلۂ مہر و محبّت برہم
نازنیں بھول گئے ناز و ادا میرے بعد

رنگِ رُخسارِ گُل و لالہ دِگرگوں ہوگا
نہ رہے گی یہ گُلستاں کی ہوا میرے بعد

عدم سے جانبِ ہستی تلاشِ یار میں آئے
تلاشِ گُل میں، ہم کِس وادیِ پُرخار میں آئے

نازِ نیازِ عاشق و معشوق کیا کہوں ؟
عجز و غرورِ شاہ و گدا کچھ نہ پُوچھیے

بُت خانہ کھود ڈالیے، مسجد کو ڈھائیے! دِل کو نہ توڑیے، یہ خُدا کا مقام ہے

جب دیکھیے کچھ اور، ہی عالم ہے تمھارا ہر بار عجب رنگ ہے، ہر بار عجب رُوپ

سچ ہے جو جیسا کرے، ویسا ہی آجاتا ہے پیش عِشق کو بدنام کر کے حُسن رُسوا ہو گیا

دَیر و حرم میں شیخ و برہمن رہیں خراب ملتا ہے وہ کہاں؛ کہیں جس کا مکاں نہ ہو

دِل کہیں، جان کہیں، چشم کہیں، گوش کہیں اپنے مجموعہ کا ہر ایک ورق برہم ہے

عاقِل اِتنے تو بکارِ خویش دیوانے ہیں ہم موسِمِ گُل تک گریباں پھاڑنے کا ہوش ہے

موت مانگوں، تو رہے آرزوئے خواب مجھے ڈُوبنے جاؤں، تو دریا مجھے پایاب ملے

کعبہ سے دَیر، دَیر سے کعبے کو جا پھکے کیا کیا نہ اِس دوراہے میں ہم پھیر کھا چکے؟

ہر شب شبِ برات ہے، ہر روز روزِ عید سوتے ہیں، ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کر

پادشاہی سے فقیری کا ہے پایہ بالا بوریا چھوڑ کے، کیا تختِ سُلیماں مانگوں؟

وہ نِگاہیں نہیں اگلی سی تمھاری ہم سے حال پر اپنے وہ اشفاق، وہ الطاف نہیں

احسان مانو، حُسنِ خدا داد کا بُتو! پتھر تھے، تُم کو شیشے سے نازک بنا دِیا

بھر گیا دامنِ نظارہ گُلِ نرگس سے آنکھ اُٹھا کر جو کبھی تو نے اِدھر دیکھ لیا

ناگُفتنی ہے حالِ بہار و خزانِ داغ اِک زخم ہے کہ خشک ہُوا اور نم ہُوا

قابُو میں یار عِشق کی تاثیر سے ہُوا کیا حُسنِ اتّفاق؟ یہ تدبیر سے ہُوا

کون ملتا ہے، اگر ملتا نہیں وہ نازنیں
میں بھی اُس ناآشنا کا آشنا ہوتا نہیں

عدم سے جانبِ ہستی تلاشِ یار میں آئے
ہوائے گُل میں، ہم کس وادیِ پُرخار میں آئے؟

یوسف کی جستجو میں روانہ ہیں قافلے
نالاں جرس ہیں، شور ہے کوسِ رحیل کا

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا، تری محفل میں رہ گیا

کیا جگہ؟ کوچۂ محبوب ہے، سبحان اللہ!
کوئی کعبہ، کوئی جنت، کوئی گلشن سمجھا

کام کرتی رہی وہ چشمِ فسوں ساز اپنا
لبِ جاں بخش دکھایا کیے اعجاز اپنا

سعیِ لاحاصل، مداوائے مریضِ عشق ہے
تھامنا ممکن نہیں، گرتی ہوئی دیوار کا

دوستوں سے اِس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

دیا نہ ساتھ جو صبر و قرار نے نہ دیا
روانہ ملکِ عدم کو جریدہ ہونا تھا

وہ نہیں ہوں، کہ رکھائی سے تری ٹل جاؤں گا
آج جاتا تھا، تو ضد سے تری کل جاؤں گا

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں، تو نظارہ ہوائے سُنبلستاں کا

سامنے آئنہ رکھتے، تو غش آجاتا
تم نے انداز نہیں اپنی ادا کا دیکھا

مومن ۔ حکیم مومن خاں

ولادت ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء
وفات ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء

اثر اُس کو ذرا نہیں ہوتا — رنج راحت فزا نہیں ہوتا
ذکرِ اغیار سے ہُوا معلوم — حرفِ ناصح بُرا نہیں ہوتا
اُس نے کیا جانے! کیا کِیا لے کر؟ — دِل، کِسی کام کا نہیں ہوتا
تُم ہمارے کِسی طرح نہ ہُوئے — ورنہ، دُنیا میں کیا نہیں ہوتا؟
تُم مِرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دُوسرا نہیں ہوتا
حالِ دِل یار کو لکھوں کیوں کر؟ — ہاتھ، دِل سے جُدا نہیں ہوتا
چارۂ دِل سِوائے صبر نہیں — سو، تُمھارے سِوا نہیں ہوتا
کیوں سُنے عرضِ مُضطر؟ اے مومن! — صنم، آخر خُدا نہیں ہوتا

(۲)

دِل قابلِ محبّتِ جاناں نہیں رہا — وہ ولولہ، وہ جوش، وہ طُغیاں نہیں رہا
بے کاریِ اُمید سے فُرصت ہے رات دِن — وہ کاروبارِ حسرت و حِرماں نہیں رہا
بے سیرِ دشت و بادیہ لگنے لگا ہے جی — اور اِس خراب گھر میں، کہ ویراں نہیں رہا
نیند آ گئی فسانۂ گیسو و زُلف سے — وہم و گمانِ خوابِ پریشاں نہیں رہا
کِس کام کے رہے؛ جو کسی سے رہا نہ کام — سر ہے، مگر غرور کا ساماں نہیں رہا

(۳)

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں، اور کِس ادا کے ساتھ؟ — بے طاقتی کے طعنے ہیں، عُذرِ جفا کے ساتھ
بہرِ عیادت آئے وہ، لیکن قضا کے ساتھ — دم ہی نکل گیا مِرا آوازِ پا کے ساتھ
وہ لالہ رُو گیا نہ ہو گُل گشتِ باغ کو — پُھر رنگ، بوئے گُل کے عوض ہے صبا کے ساتھ
یادِ ہوائے یار نے کیا کیا نہ گُل کھلائے — آئی چمن سے نکہتِ گُل، جب صبا کے ساتھ
مانگا کریں گے، اب سے دعا ہجرِ یار کی — آخر تو دشمنی ہے اثر کو، دُعا کے ساتھ

یارب! وصالِ یار میں کیوں کر ہو زندگی؟ — نکلی ہی جان جاتی ہے، ہر ہر ادا کے ساتھ
اللہ ری گمرہی! بُت و بُت خانہ چھوڑ کر — مومنؔ چلا ہے کعبے کو اِک پارسا کے ساتھ

(۴)

محو مجھ سا، دمِ نظارۂ جاناں ہو گا — آئنہ، آئنہ دیکھے گا تو حیراں ہو گا
خواہشِ مرگ ہو، اِتنا نہ ستانا، ورنہ — دِل میں پھر تیرے ہوا اور بھی ارماں ہو گا
کیا سُناتے ہو؟ کہ ہے ہجر میں جینا مشکل — تُم سے بے رحم پہ مرنے تو آساں ہو گا
کیوں کر اُمیدِ وفا سے ہو تسلّی دِل کو؟ — فکر یہ ہے، کہ وہ وعدے پہ پشیماں ہو گا
بات کرنے میں رقیبوں سے ابھی ٹوٹ گیا — دِل بھی شاید اُسی بد عہد کا پیماں ہو گا
درد ہے جاں کے عوض، ہر رگ و پے میں ساری — چارہ گر! ہم نہیں ہونے کے، جو درماں ہو گا
دوستی اُس صنمِ آفتِ ایماں سے کرے — مومنؔ! ایسا بھی کوئی دشمنِ ایماں ہو گا؟

(۵)

غیروں پہ کُھل نہ جائے کہیں راز، دیکھنا — میری طرف بھی، غمزۂ غمّاز! دیکھنا!
اُڑتے ہی رنگِ رُخ مِرا، نظروں سے تھا نہاں — اِس مُرغِ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا!
دُشنامِ یار، طبعِ حزیں پر گراں نہیں — اے ہم نشیں! نزاکتِ آواز دیکھنا!
دیکھ اپنا حالِ زار، منجّم ہُوا رقیب — تھا سازگار، طالعِ ناساز دیکھنا!
کُشتہ ہوں اُس کی چشمِ فسوں گر کا، اے رقیب! — کرنا سمجھ کے دعویِٔ اعجاز، دیکھنا!
ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے — مومنؔ! غمِ مآل کا آغاز، دیکھنا!

(۶)

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی، یعنی وعدہ نباہ کا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لُطف مجھ پہ تھے بیشتر، وہ کرم کہ تھا مِرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے، وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمھیں یاد ہو، کہ نہ یاد ہو
کبھی بیٹھے سب کے جو روبرو، تو اشارتوں ہی میں گفتگو،
وہ بیان، شوق کا برملا، تمھیں یاد ہو، کہ نہ یاد ہو
ہُوئے اتفاق سے گر بہم، تو وفا جتانے کو دم بہ دم
گلۂ ملامتِ اقربا، تمھیں یاد ہو، کہ نہ یاد ہو
کوئی بات ایسی اگر ہوئی، کہ تمھارے جی کو بُری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا، تمھیں یاد ہو، کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمھیں یاد ہو، کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمھیں یاد ہو، کہ نہ یاد ہو

(۷)

ناوکِ انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے، کئی بے جاں ہوں گے
تابِ نظارہ نہیں، آئنہ کیا دیکھنے دوں ؟
اور بن جائیں گے تصویر، جو حیراں ہوں گے
تو کہاں جائے گی ؟ کچھ اپنا ٹھکانا کرلے
ہم تو کل خوابِ عدم میں، شبِ ہجراں ! ہوں گے
ایک ہم ہیں، کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں، کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے
منّتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے ؟
عُمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن !
آخری وقت میں، کیا خاک مسلماں ہوں گے ؟

(۸)

صبر، وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے ؟
دیکھو، مت دیکھیو ! کہ آئنہ
غش، تمھیں دیکھ کر نہ ہو جائے

کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم / کہیں پامال سر نہ ہوجائے

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ! / تجھے اپنی نظر نہ ہوجائے

میرے آنسو نہ پونچھنا، دیکھو! / کہیں دامان تر نہ ہوجائے

مومنؔ: ایماں قبول دل سے مجھے / وہ بُت آزردہ، گر نہ ہوجائے

(۹)

آج اُس بزم میں طوفان اُٹھا کے اُٹھے / یاں تلک روئے، کہ اُس کو بھی رُلا کے اُٹھے

گر نہ ہو دل میں خیالِ نگہِ خواب آلود / درد کیا کیا اثرِ خفتہ جگا کے اُٹھے؟

گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے اک حرفِ غلط / لیک اُٹھے بھی، تو اِک نقش بٹھا کے اُٹھے

اُف رے گرمیِ محبت! کہ ترے سوختہ جاں / جس جگہ بیٹھ گئے، آگ لگا کے اُٹھے

جی ہی مانندِ نشانِ کفِ پا بیٹھ گیا / پانْو کیا کوچے سے اُس ہوش رُبا کے اُٹھے

(۱۰)

وصل کی شب، شام سے میں سو گیا / جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا

دل نہ پھرا، جان ہی ٹھہرے، خدا! / یہ تو نہ جانے کہیں، وہ تو گیا

شوخیِ قاتل کے میں قربان ہوں / کہتے رہے سب، یہ گیا، وہ گیا

ہاے صنم: ہاے صنم! اب یہ کیوں؟ / خیر ہے مومنؔ! تمھیں کیا ہو گیا؟

(۱۱)

زرد مُنھ دِکھلا دیا، غم کا اثر دِکھلا دیا / آج ہم نے اُس کو اپنا زرد و زر دِکھلا دیا

موت کے صدقے، کہ وہ بے پردہ آئے لاش پر / جو نہ دیکھا تھا تماشا عمر بھر، دِکھلا دیا

اُس کے دل میں اب خیالِ قتل ہردم آئے ہے / موت کو کس نے اِلٰہی! میرا گھر دِکھلا دیا

نام اُلفت کا نہ لوں گا، جب تلک ہے دم میں دم / تو نے چاہت کا مزا اے فتنہ گر! دِکھلا دیا

دیکھیں گے مومنؔ! یہ ہم ایمانِ بالغیب آپ کا
اُس بُتِ پردہ نشیں نے جلوہ، گر دِکھلا دیا

(۱۲)

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا — دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

آنکھ نہ لگنے سے شب، احباب نے — آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

مر گئے اُس کے لبِ جاں بخش پر — ہم نے علاج آپ ہی اپنا کیا

بجھ گئی اک آہ میں شمعِ حیات — مجھ کو دمِ سرد نے ٹھنڈا کیا

زندگیِ ہجر بھی اک موت تھی — مرگ نے کیا کارِ مسیحا کیا

سچ ہی سہی آپ کا ایماں، ولے — مرگ نے کب وعدۂ فردا کیا

دشمنِ مومنؔ ہی رہے بُت سدا — مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا؟

(۱۳)

وعدۂ وصلت سے دل ہو شاد کیا؟ — تجھ سے دشمن کی مبارکباد کیا؟

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا؟

نالۂ پیہم سے یاں فرصت نہیں — حضرتِ ناصح کریں ارشاد کیا؟

ہیں اسیر اُس کے، جو ہے اپنا اسیر — ہم نہ سمجھے، صید کیا؟ صیّاد کیا؟

کیا کروں؟ اللہ! سب ہیں بے اثر — ولولہ کیا؟ نالہ کیا؟ فریاد کیا؟

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا؟

بُت کدہ جنت ہے، چلیے بے ہراس — لب پہ مومنؔ: ہر چہ بادا باد کیا؟

(۱۴)

ٹھانی تھی دل میں، اب نہ ملیں گے کسی سے ہم — پر کیا کریں؟ کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

بیزار جان سے جو نہ ہوتے، تو مانگتے — شاہد شکایتوں پہ تری، مدّعی سے ہم

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا — لو بندگی، کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

بے روئے مثلِ ابر، نہ نکلا غبارِ دل — کہتے تھے اُن کو برقِ تبسّم ہنسی سے ہم

کیا گُل کھلے گا دیکھیے؟ ہے فصلِ گُل تو دور — اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا ؛
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

لے نام آرزو کا، تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں، جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

(۱۵)

تاثیر صبر میں، نہ اثر اضطراب میں
بیچارگی سے جان پڑی کس عذاب میں ؟

اتنی کدورت اشک میں، حیراں ہوں، کیا کہوں ؛
دریا میں ہے سراب ؟ کہ دریا سراب میں

فکرِ مآل سے مے و شاہد رہے عزیز
پیری میں موت یاد تھی، پیری شباب میں

کھولا جو دفترِ گلہ، اپنا زیاں کیا
گزری شبِ وصال تم کے حساب میں

اے حشر ! جلد کر تہ و بالا جہان کو
یوں کچھ نہ ہو، امید تو ہے انقلاب میں

مومن ! یہ عالم اُس صنمِ جاں فزا کا ہے
دل لگ گیا جہانِ سراسر خراب میں

(۱۶)

جلتا ہوں ہجرِ شاہد و یادِ شراب میں
شوقِ ثواب نے مجھے ڈالا عذاب میں

چینِ جبیں کو دیکھ کے دل بستہ تر ہوا
کیسی کشودِ کار ؟ کشادِ نقاب میں

آنکھ اُس کی پھر گئی تھی، دل اپنا بھی پھر گیا
یہ اور انقلاب ہوا، انقلاب میں

دونوں کا ایک حال ہے، یہ مدعا ہو کاش
وہ ہی خط اُس نے بھیج دیا کیوں ! جواب میں

تقدیر بھی بری، مری تدبیر بھی بری
بگڑے وہ پرسشِ سببِ اجتناب میں

کیا جلوے یاد آئے ! کہ اپنی خبر نہیں
بے بادہ مست ہوں، میں شبِ ماہتاب میں

پیہم سجود پائے صنم پر، دمِ وداع
مومن ! خدا کو بھول گئے ! اضطراب میں

(۱۷)

کب تک نباہیے ؟ بتِ ناآشنا کے ساتھ
کیجے وفا کہاں تلک ؟ اُس بے وفا کے ساتھ

یادِ ہوائے یار نے کیا کیا نہ گل کھلائے ؛
آئی چمن سے نکہتِ گل جب صبا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ہے کس کا انتظار ؟ کہ خوابِ عدم سے بھی
ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ

یارب! وصالِ یار میں کیوں کر ہو زندگی؟ نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ
آتے ہی تیرے چل دیے سب، ورنہ یاس کا کیسا ہجوم تھا؛ دلِ حسرت فزا کے ساتھ
اللہ ری گمرہی! بت و بت خانہ چھوڑ کر مومن چلا ہے کعبے کو اِک پارسا کے ساتھ

(۱۸)

منظورِ نظر غیر سہی، اب ہمیں کیا ہے؟ بے دید، تری دید سے، دل پہلے بھرا ہے
جب گھر میں نہ ہو تم، تو رہیں کوچے میں ہم کیوں؟ شکوہ جو تمھارا، تو ہمارا بھی گلا ہے
اب شوق سے تم محفلِ اغیار میں بیٹھو یاں گوشۂ خلوت میں عجب لطف اٹھا ہے
یارب! کوئی معشوقہ، دل جو، نہ ملے اب جو اُن کی دعا ہے، وہی اپنی بھی دعا ہے
توبہ، گنہِ عشق سے فرمائے ہے واعظ یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے
مومن! نہ سہی بوسۂ پا، سجدہ کریں گے یہ بت ہے جو اوروں کا، تو اپنا بھی خدا ہے

(۱۹)

اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آ گیا ناصح! تو میری جان نہ لے، دل گیا، گیا
کچھ آنکھ بند ہوتے ہی، آنکھیں سی کھل گئیں جی اِک بلائے جان تھا، اچھا ہوا، گیا
آنکھیں جو ڈھونڈتی تھیں، نگہ ہائے التفات گم ہونا دل کا وہ مری نظروں سے پا گیا
آہِ سحر ہماری فلک کو پھری نہ ہو کیسی ہوا چلی یہ! کہ جی سنسنا گیا
آتی نہیں بلائے شبِ غم نگاہ میں کس مہروش کا جلوہ نظر میں سما گیا؟
اب جذبِ دل! نہ تھم! کہ نہ ٹھہرا وہ شعلہ رو آیا تو گرم گرم، ولیکن چلا گیا

(۲۰)

تھے دشت میں ہمراہ مرے آبلۂ چند سو آپ ہی پامال کیا قافلہ اپنا
لبیکِ حرم ہم ہیں نہ ناقوسِ کلیسا پھر شیخ و برہمن میں ہے کیوں غلغلہ اپنا
زندہ نہ ہوا ہائے دلِ مردہ اگر چہ تھا شورِ قیامت سے فزوں ولولہ اپنا
صورت وہی، عظمت وہی، گردش وہی، کیسے؟ حیراں ہیں، کہ یہ چرخ ہے، یا آبلہ اپنا

انصاف کے خواہاں ہیں، نہیں طالبِ زر ہم
تحسینِ سخن فہم ہے، مومنؔ! صلہ اپنا

(۲۱)

ہم جاں فدا کرتے، گر وعدہ وفا ہوتا
مرنا ہی مقدّر تھا، وہ آتے تو کیا ہوتا؟

جنّت کی ہوس واعظ! بے جا ہے کہ عاشق ہوں
ہاں سیر میں دل لگتا، گر دل نہ لگا ہوتا

ہونا تھا وصال اِک شب، قسمت میں، بلا سے گر
تو مجھ سے خفا ہوتا، میں تجھ سے خفا ہوتا

ہے بیخودیِ دائم، کیا شکوہ تغافل کا
جب میں نہ ہُوا اپنا، وہ کیوں کہ مرا ہوتا؟

ہم بندگیِ بُت سے، ہوتے نہ کبھی کافر
ہر جائے گر اے مومنؔ! موجود خدا ہوتا

(۲۲)

سجدے پہ سر قلم ہو، دعا پر زباں کٹے
گویا نہ وہ زمیں ہے، نہ وہ آسماں ہے اب

قتلِ عدو نے شوقِ شہادت مٹا دیا
لب پر ہمارے غلغلۂ الاماں ہے اب

رکھ لے سر اپنے زانوئے نازک پہ شوق سے
تیرا مریضِ عشق بہت ناتواں ہے اب

چشمِ غضب سے مشورۂ قتل کھل گیا
جو بات دل میں تھی، سو نظر سے عیاں ہے اب

بے طاقتی سے مجھ میں نہیں تابِ التفات
بیہودہ فکرِ جور و سرِ امتحاں ہے اب

وہ دن گئے، کہ لاف و گزافِ جہاد تھا
مومن ہلاکِ خنجرِ نازِ بتاں ہے اب

(۲۳)

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی، مری طرح

تشبیہ کس سے دوں؟ کہ طرحدار کی مرے
سب سے نرالی وضع ہے، سب سے نئی طرح

نے تابِ ہجر میں ہے، نہ آرام وصل میں
کمبخت دل کو چین نہیں ہے، کسی طرح

نے جائے واں بنے ہے، نہ بِن جائے چین ہے
کیا کیجیے؟ ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

ہوں جاں بہ لب، بتانِ ستمگر کے ہاتھ سے
کیا سب جہاں میں جیتے ہیں، مومنؔ! اسی طرح؟

(۲۵)

قہر ہے، موت ہے، قضا ہے عشق　　سچ تو یہ ہے، بُری بلا ہے عشق
اثرِ غم! ذرا بتا دینا　　وہ بہت پوچھتے ہیں، کیا ہے عشق؟
وصل میں احتمالِ شادیِ مرگ　　چارہ گر! دردِ لادوا ہے عشق
ہم کو ترجیح تم پہ ہے، یعنی　　دلرُبا حُسن و جاں رُبا ہے عشق
آپ ہم سے خفا ہیں گے، سچ ہے　　باوفا حُسن، بے وفا ہے عشق
قیس و فرہاد و وامق و مومن　　مر گئے سب ہی، کیا وبا ہے عشق!

(۲۶)

دن بھی دراز، رات بھی، کیوں ہے فراقِ یار میں؟
کاہے سے فرق آگیا؟ گردشِ روزگار میں
خاک میں وہ تپش نہیں، خار میں وہ خلش نہیں
کیوں نہ ہمیں زیادہ ہو؟ جوشِ جنوں بہار میں
مرگ ہے انتہائے عشق، یاں رہی ابتدائے عشق
زندگی اپنی ہو گئی، رنجشِ بار بار میں
پوچھا ہے اُس نے کیا مری بیخودی و قلق کا حال؟
ہوش نہیں جو اس میں، تاب نہیں قرار میں
خاک اُڑائی گُل نے یہ، کس کے جنونِ عشق میں؟
آئی ہے کچھ اٹی ہوئی بادِ صبا غبار میں
دھیان میں مومن آگئی، بحثِ جبر و اختیار
قابوئے یار میں ہیں ہم، وہ نہیں اختیار میں

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے　　جی بلا سے رہا، رہا، نہ رہا

ناصحِ ناداں! یہ دانائی نہیں　　دل کو سمجھاؤں؟ میں سودائی نہیں
کس توقّع پر اُمیدِ وصل اب　　طاقتِ صبر و شکیبائی نہیں

ہے دوستی، تو جانبِ دُشمن نہ دیکھنا!　　جادُو بھرا ہُوا ہے تُمھاری نگاہ میں
مومنؔ کو پہنچ ہے دَولتِ دُنیا و دیں نصیب　　شب بُتکدے میں گُزرے ہے، دِن خانقاہ میں

معشُوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری　　واں لُطف کم ہُوا، تو یہاں پیار کم ہُوا
اَے غزال چشم سدا میرے دام میں　　صیّاد ہی رہا مَیں، گرفتار کم ہُوا

حیرتِ دیدار! بس آئینہ رکھ دے ہاتھ پر　　اپنی حالت دیکھ کر، غافِلؔ! کُٹا جاتا ہے جیتا

جہاں سے شکل کو تیری، ترس ترس گُزرے　　جو تُجھ پہ بس نہ چلا، اپنے جی سے بس گُزرے

کِس کی خبر اب آنے کی ہے؟ کِس لیے ہے یہ بیتابی؟
کِس لیے ہم ہیں ہر دم پھرتے؟ آتے ہیں اور جاتے ہیں
کُنجِ قفس میں بیٹھ کے گاہے روتے ہیں تنہائی پر
یادِ سَیرِ موسمِ گُل سے گاہے جی بہلاتے ہیں

اُس کے اُٹھتے ہی ہم جہاں سے اُٹھے　　کیا قیامت ہے جی کا آ جانا

بعدِ مُدّت اُس کوچے میں، لوٹ پھر کے تنگ آ کر　　بھولے بھالے پھرتے ہیں پُوچھتے مکاں اپنا

شمع ساں اپنی تپش ہے، تو سُنے یا نہ سُنے　　طے نہ ہووے گا یہ افسانہ زباں جلنے تک

آئے ہے خواب میں کبھی تیری زُلف کا خیال　　بے طور گھر گئے ہیں پریشانیوں میں ہم

کیا کیجیے؛ کہ طاقتِ نظارہ ہی نہیں
جتنے وہ بے حجاب ہیں، ہم شرمسار ہیں

رقیب کھائے قسم، تو وفا کا آئے یقیں
تو میری جان ہے، کیا تیرا اعتبار مجھے؛

منظور ہو، تو وصل سے بہتر ستم نہیں
ہنستا رہا ہوں دُکھ، کہ ہجراں کا غم نہیں

جذبِ دِل اُسے کھینچ کے لائے، تو کہاں لائے؟
جو غیر کا گھر ہے، وہی مسکن ہے ہمارا

عُمر دراز کی ہے رقیبوں کو آرزو
دیکھو! زمانِ ہجر کے اُمّیدوار ہیں

سینے پہ ہاتھ دھرتے ہی، کچھ دم پہ بن گئی
لو: جان کا عذاب ہُوا، دِل کو تھامنا

دِل میں ناصح! آئے کب اپنا خیال؟
جا سکے کب یار کے مسکن میں ہم؟

بیخود تھے، غش تھے، محو تھے، دُنیا کا غم نہ تھا
جینا وِصال میں بھی تو، ہجراں سے کم نہ تھا

ڈوبا جو کوئی آہ! کنارے پہ آ گیا
طغیانِ بحرِ عشق ہے ساحل کے آس پاس

اِعجاز سے زیادہ ہے سحر اُن کے ناز کا
آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں، جو لب سے بیاں نہ ہو

کیا ایسے سے دعویٰ ہو، محشر میں؟ کہ میں نے تو
نظارۂ قاتل کو احسانِ اجل جانا

آنکھ لگتے ہی ناصح! کچھ نظر نہیں آتا
گر یقیں نہیں حضرت! آپ بھی لگا دیکھیں

مارے خوشی کے مر گئے، صبحِ شبِ فراق
کتنے سُبک ہُوئے ہیں گراں جانیوں میں ہم

اِس ضُعف میں تو سینے سے آتا ہے لب تلک
کہتے ہیں اپنے نالے کو ہم نارسا عبث

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو
ضُعف کے باعث کہاں دُنیا سے اُٹھا جائے ہے؟

مژدۂ وصل سناتے ہیں مجھے
وہ جو کہتے ہیں، یہ تجھے آگ لگے

کیا ناصحِ شفیق نے مژدہ سُنا دیا
فرماتے ہیں، وصال ہے انجامِ کارِ عشق

عالم شبِ وصال کے آنکھوں میں چھا گئے
واعظ کے ذکرِ مہرِ قیامت کو کیا کہوں؟

ہمارے عشق کا چرچا کہاں کہاں نہ ہُوا!
دمِ حساب رہا روزِ حشر بھی یہ ذکر

تو آپ اپنے دام میں صیّاد آ گیا
اُلجھا ہے پاؤں یار کا زُلفِ دراز میں

جی خاک ہو گیا، مجھے آرام جب ہُوا
تھا میں یہ رنگِ شعلۂ جوّالہ بے قرار

اُس کو بھی آج نیند نہ آئی تمام شب
مومن! میں اپنے نالوں کے صدقے، کہ کہتے ہیں

گر دردِ عشق ہو، تو اُمیدِ شفا عبث
گو چارہ ساز حضرتِ عیسیٰ ہی کیوں نہ ہوں؟

کیا کوئی اپنا ٹھکانہ چھوڑ دے؟
وصل میں بھی دل سے غم جاوے کہاں؟

دوزخ میں ڈال کعبے کو، کوئے بتاں نہ چھوڑ!
مومن! خدا کے واسطے ایسا مکاں نہ چھوڑ!

ناصح! یہ بندِ غم نہیں، قیدِ حیات ہے
چھُٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی

تم نے اچھا کیا، نباہ نہ کی
میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے

کہ ہر ہر بات میں ناصح تمھارا نام لیتا تھا
نہ مانوں گا نصیحت، پر نہ میں سنتا تو کیا کرتا؟

آنکھیں لگی ہیں دولتِ بیدار کی طرف
شامِ فراق خوابِ عدم کا ہے انتظار

ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں
تا نہ خلل پڑے کہیں آپ کے خوابِ ناز میں

غالب - مرزا اسد اللہ خاں

ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ / ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء
وفات ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ / ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا ؟ — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی، دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
بس کہ ہوں غالب! اسیری میں بھی آتش زیرِ پا — موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

(۲)

دہر میں نقشِ وفا، وجہِ تسلی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ، کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا، کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں — وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی، کہ کبھی — گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے ؛ — ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب — ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

(۳)

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی — میری وحشت، تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی ؟ — اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے ! — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام — دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے، اے فلکِ ناانصاف! — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی

یارے چھیڑ چلی جائے، اسدؔ!	گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی

(۴)

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا	جس دِل پہ ناز تھا مجھے، وہ دِل نہیں رہا
مرنے کی، اے دِل! اور ہی تدبیر کر، کہ مَیں	شایانِ دست و بازوئے قاتِل نہیں رہا
وا کر دیے ہیں شوق نے، بندِ نقابِ حُسن	غیر از نگاہ، اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار	لیکن ترے خیال سے غافِل نہیں رہا
بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا، مگر اسدؔ!	جس دِل پہ ناز تھا مجھے، وہ دِل نہیں رہا

(۵)

کوئی دِن گر زِندگانی اور ہے	اپنے جی میں، ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟	سوزِ غمہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں	پر، کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط، منھ دیکھتا ہے نامہ بر	کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم	وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہو چکیں، غالبؔ! بلائیں سب تمام	ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

(۶)

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر؟	جلتا ہوں، اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
ثابت ہُوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق	لرزے ہے موجِ مے، تری رفتار دیکھ کر
واحسرتا! کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ	ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر
بِک جاتے ہیں ہم آپ، متاعِ سخن کے ساتھ	لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
اِن آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا مَیں	جی خوش ہُوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طور پر	دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا	یاد آ گیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر

(۷)

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم، کہ "تو کیا ہے؟" — تمھیں کہو! کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا — کوئی بتاؤ، کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے؟

یہ رشک ہے، کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے — وگرنہ خوفِ بد آموزیٔ عدو کیا ہے؟

چپک رہا ہے بدن پر، لہو سے پیراہن — ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہو گا — کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے؟

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے؟

وہ چیز، جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو کیا ہے؟

رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی — تو کس امید پہ کہیے، کہ آرزو کیا ہے؟

ہوا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا — وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

(۸)

آہ کو چاہیے اِک عمر، اثر ہونے تک — کون جیتا ہے، تری زلف کے سر ہونے تک؟

دامِ ہر موج میں ہے، حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ، گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب، اور تمنا بے تاب — دِل کا کیا رنگ کروں، خونِ جگر ہونے تک؟

ہم نے مانا، کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن — خاک ہو جائیں گے، ہم، تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے، ہے شبنم کو فنا کی تعلیم — میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی، غافل! — گرمیِ بزم ہے اِک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا، اسد! کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(۹)

دیا ہے دِل اگر اُس کو، بشر ہے، کیا کہیے؟ — ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے؟

یہ ضد کہ آج نہ آوے، اور آئے بن نہ رہے — قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے؟ کیا کہیے؟

زہے کرشمہ! کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب — کہ بن کہے ہی اُنھیں سب خبر ہے، کیا کہیے:

سمجھ کے کرتے ہیں، بازار میں، وہ پرسشِ حال — کہ یہ کہے، کہ سرِ رہ گزر ہے، کیا کہیے؟
حسد، سزائے کمالِ سخن ہے، کیا کیجے؟ — ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کہیے؟
کہا ہے کس نے کہ غالبؔ بُرا نہیں، لیکن — سوائے اِس کے کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہیے؟

(۱۰)

بجز قیس، اور کوئی نہ آیا بروئے کار — صحرا، مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا
آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست — ظاہر ہُوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
تھا خواب میں، خیال کو تجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا، نہ سود تھا
لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز — لیکن یہی، کہ رفت گیا، اور بود تھا
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — میں، ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسدؔ! — سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

(۱۱)

شوقِ ہر رنگ، رقیبِ سروساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی، یارب! — تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا
بوئے گُل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا
ہے نَو آموزِ وفا، ہمتِ دشوار پسند — سخت مشکل ہے، کہ یہ کام بھی آساں نکلا
دل میں، پھر گریہ نے اِک شور اُٹھایا غالبؔ! — آہ! جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

(۱۲)

دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبرد تھا — عشقِ نبرد پیشہ، طلب گارِ مرد تھا
دل تا جگر، کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب — اِس رہ گزر میں، جلوۂ گُل آگے گرد تھا
جاتی ہے کشمکش کوئی اندوہِ عشق کی — دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا
احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے — زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا
یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے — حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا

(۱۳)

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ؟
نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا ؟

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا ؟

دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا ؟

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اُس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا ؟

سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا! سُن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا ؟

کیا کس نے جگر داری کا دعوی؟
شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا ؟

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں ؟
یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا ؟

بلائے جاں ہے، غالب! اُس کی ہر بات
عبارت کیا ؟ اشارت کیا ؟ ادا کیا ؟

(۱۴)

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل، جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنّا، یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال
دلِ گُم گشتہ مگر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

مَیں نے مجنوں پہ، لڑکپن میں اسد!
سنگ اُٹھایا تھا، کہ سر یاد آیا

(۱۵)

کی وفا ہم سے، تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے، کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے! کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انھیں کچھ نہ کہو!
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالہ کو رسا کہتے ہیں ؟

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود — قبلہ کو، اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
دیکھیے! لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت، کیا رنگ؟ — اُس کی ہر بات پہ ہم 'نامِ خدا' کہتے ہیں
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید — مر گیا غالبِ آشفتہ نوا، کہتے ہیں

(۱۶)

دیوانگی سے دوش پہ زنّار بھی نہیں — یعنی، ہماری جیب میں اِک تار بھی نہیں
ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے، کہ دشوار بھی نہیں
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے، اور یاں — طاقت، بہ قدرِ لذّتِ آزار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے، ہے سر وبالِ دوش — صحرا میں، اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں
اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے! اے خدا! — لڑتے ہیں، اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا — دیوانہ گر نہیں ہے، تو ہشیار بھی نہیں

(۱۷)

دِل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

دَیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں؟

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منھ چھپائے کیوں؟

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

حسن اور اس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں؟
واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں؟
ہاں، وہ نہیں وفا پرست، جاؤ، وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دلِ عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں؟
غالبِ خستہ کے بغیر، کون سے کام بند ہیں؟
روئیے زار زار کیوں؟ کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

(۱۸)

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی، نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی
نفسِ قیس، کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ، نہ سہی
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی
نہ ستائش کی تمنّا، نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی
عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب! اگر عمرِ طبیعی، نہ سہی

(۱۹)

غم کھانے میں بودا، دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج، کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے، نہ صیّاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے، مجھے آرام بہت ہے
کیا زہد کو مانوں، کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے
ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں؟
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ!
رہنے دے مجھے یاں، کہ ابھی کام بہت ہے
ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے؟
شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

(۲۰)

منظور تھی یہ شکل، تجلّی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

اِک خوں چکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ! نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی!

آمد بہار کی ہے، جو بلبل ہے نغمہ سنج
اُڑتی سی اِک خبر ہے زبانی طیور کی

کیا فرض ہے، کہ سب کو ملے ایک سا جواب؟
آؤ نہ! ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اِس قدر
کی جس سے بات، اُس نے شکایت ضرور کی

(۲۱)

دِل مرا سوزِ نہاں سے، بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

دِل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اِس گھر میں لگی ایسی، کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ غافل! بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں؟
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا، کہ صحرا جل گیا

مَیں ہوں اور افسردگی کی آرزو، غالبؔ! کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

(۲۲)

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اب مَیں ہوں، اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئنہ، تمثال دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو، کہ مَیں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ، آب دار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر اب
دیکھا، تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

(۲۳)

بس کہ دُشوار ہے، ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں، اِنساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیِ شوق! کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر، اور آپ ہی حیراں ہونا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم، داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر، غرقِ نمک داں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے! اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف! اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب!
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۲۴)

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اِس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو، تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا؟
بات کرتے، کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر، ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا!

ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب!
کہتے ہیں، اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

(۲۵)

ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

منظر اِک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اِدھر ہوتا، کاش کے مکاں اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں، اُن کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

تاکرے نہ غمازی، کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں، ہم نے ہم زباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب، دشمن آسماں اپنا

(۲۶)

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا، ہے دوا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ اللہ!
اِس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا!

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال / ہو گیا، گوشت کا ناخن سے جدا ہو جانا

ہے مجھے، ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا / روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس / کیوں ہے؟ گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل / ق / دیکھ، برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ! / چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

(۲۷)

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد / بارے، آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا / ہوئی معزولیِ انداز و ادا، میرے بعد

شمع بجھتی ہے، تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے / شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا، میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر، یعنی / ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا، میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق؟ / ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا، میرے بعد

غم سے مرتا ہوں، کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی / کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا، میرے بعد

آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ! / کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا، میرے بعد

(۲۸)

ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور / کرتے ہیں محبت، تو گزرتا ہے گماں اور

یارب! وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات / دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم؟ جب اٹھیں گے / لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں / ہم ہیں، تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ، ہر چند سر اڑ جائے / جلاد کو، لیکن وہ کہے جائیں، کہ ہاں! اور

لیتا، نہ اگر دل تمہیں دیتا، کوئی دم چین / کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا / ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے / کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

(۲۹)

ہم پر، جفا سے، ترکِ وفا کا گماں نہیں
اِک چھیڑ ہے، وگرنہ مُراد اِمتحاں نہیں

کس مُنھ سے شکر کیجیے، اِس لُطفِ خاص کا
پرسش ہے، اور پاے سُخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز، ستم گر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں

ہے ننگِ سینہ، دِل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دِل، نفس اگر آذر فشاں نہیں

نُقصاں نہیں جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی
رُوحُ القُدس، اگرچہ مِرا ہم زباں نہیں

جاں ہے بہاے بوسہ، ولے کیوں کہے، ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

(۳۰)

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکّر ہے مِرے پاؤں میں، زنجیر نہیں

شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو، کہ جہاں
جادہ، غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جُز دمِ شمشیر نہیں

رنجِ نومیدیِ جاوید! گوارا رہیو!
خوش ہوں، گر نالہ زبُونی کشِ تاثیر نہیں

سر کھجاتا ہے، جہاں زخمِ سر اچھّا ہو جائے
لذّتِ سنگ، بہ اندازۂ تقریر نہیں

جب کرم رُخصتِ بے باکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر، بجُز خجلتِ تقصیر نہیں

غالبؔ! اپنا یہ عقیدہ ہے بہ قولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو مُعتقدِ میرؔ نہیں

(۳۱)

ملتی ہے خوے یار سے نار اِلتہاب میں
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں؟ کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں؟
شب ہاے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ اِنتظار میں نیند آئے عُمر بھر
آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے، خط اِک اور لکھ رکھوں
مَیں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مُجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں؟
میں اور حظِّ وصل، خدا ساز بات ہے جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں
غالب! چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

(۳۲)

کل کے لیے، کر آج نہ خسّت شراب میں یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع؟ گر، وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے! تھمے؟ نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود، ایک ہے حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں؟
ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں
غالب! ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

(۳۳)

ذکر میرا، بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں غیر کی بات بگڑ جائے، تو کچھ دور نہیں
وعدۂ سیرِ گلستاں ہے، خوشا طالعِ شوق! مژدۂ قتل مقدّر ہے، جو مذکور نہیں
شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے، عالم لوگ کہتے ہیں، کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں
قطرہ اپنا بھی، حقیقت میں ہے دریا، لیکن ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں
میں جو کہتا ہوں کہ "ہم لیں گے قیامت میں تمھیں" کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"
ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی، غالب! میرے دعوے پہ یہ حجّت ہے، کہ مشہور نہیں

(۳۴)

حیراں ہوں، دل کو روؤں، کہ پیٹوں جگر کو میں مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے، کہ ترے گھر کا نام لوں / ہر اک سے پوچھتا ہوں، کہ جاؤں کدھر کو میں؟
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار / اے کاش! جانتا نہ تری رہ گزر کو میں
لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ 'یہ بے ننگ و نام ہے' / یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دور، ہر اک تیز رو کے ساتھ / پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
خواہش کو، احمقوں نے پرستش دیا قرار / کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیدادگر کو میں؟
پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار / جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
اپنے پہ، کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا / سمجھا ہوں دل پذیر، متاعِ ہنر کو میں
غالبؔ! خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز / دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

(۳۵)

نالہ، جز حسنِ طلب، اے ستم ایجاد! نہیں / ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب / ہم کو تسلیم نکونامیِ فرہاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم / دشت میں ہے وہ مجھے عیش، کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب / لطمۂ موج، کم از سیلیِ استاد نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں، ترے کوچے سے، بہشت / یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں
کرتے کس منہ سے ہو، غربت کی شکایت غالبؔ! / تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں؟

(۳۶)

سب کہاں؟ کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں / خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی، کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی، رنگا رنگ بزم آرائیاں / لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
قید میں، یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر / لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے / ہے زلیخا خوش، کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں
نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں / تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
میں چمن میں کیا گیا؟ گویا دبستاں کھل گیا / بلبلیں سن کر مرے نالے، غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب! دل کے پار؟
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی، گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر، کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ، تو اے اہلِ جہاں!
دیکھنا ان بستیوں کو تم، کہ ویراں ہو گئیں

(۳۷)

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں، کہ میری بات سمجھنی محال ہے

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلا؟
دل، فردِ جمع و خرچِ زباں ہائے لال ہے

کس پردہ میں ہے آئنہ پرداز، اے خدا!
رحمت، کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

ہے ہے! خدا نخواستہ، وہ اور دشمنی!
اے شوقِ منفعل، یہ تجھے کیا خیال ہے؟

وحشت پہ میری، عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو، اسدؔ!
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

(۳۸)

بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے، بہ اندازِ چکیدن سر نگوں وہ بھی

رہے اس شوخ سے آزردہ، ہم چندے تکلّف سے
تکلّف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

خیالِ مرگ، کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنّا میں، ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بے تابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش، ساقیِ گردوں سے کیا کیجے؟
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ، شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے، جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

(۳۹)

اُس بزم میں، مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے

دل ہی تو ہے، سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں، اور جاؤں در سے ترے، بِن صدا کیے.

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجّادہ رہنِ مے — مدّت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں، کہ اے لئیم! — تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو؟ — کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے؟
ضد کی ہے اور بات، مگر خو بری نہیں — بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے
غالبؔ! تمھیں کہو، کہ ملے گا جواب کیا؟ — مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

(۴۰)

دیکھنا قسمت، کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے — میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے؟
ہاتھ دھو دل سے، یہی گرمی گر اندیشے میں ہے — آبگینہ، تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے
غیر کو، یارب! وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے؟ — گر حیا بھی اس کو آتی ہے، تو شرما جائے ہے
شوق کو یہ لت، کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے — دل کی وہ حالت، کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے
دورِ چشمِ بد، تری بزمِ طرب سے، واہ، واہ! — نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے
گرچہ ہے طرزِ تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق — پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں، کہ وہ پا جائے ہے
نقش کو اس کے، مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں؟ — کھینچتا ہے جس قدر، اتنا ہی کھنچتا جائے ہے
سایہ میرا، مجھ سے مثلِ دود، بھاگے ہے اسدؔ! — پاس مجھ آتش بجاں کے، کس سے ٹھہرا جائے ہے؟

(۴۱)

تسکیں کو ہم نہ روئیں، جو ذوقِ نظر ملے — حورانِ خلد میں، تری صورت مگر ملے
اپنی گلی میں، مجھ کو نہ کر دفن، بعدِ قتل — میرے پتے سے، خلق کو کیوں تیرا گھر ملے؟
ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم — ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے، جس قدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم! — میرا سلام کہیو! اگر نامہ بر ملے
تم کو بھی ہم دکھائیں، کہ مجنوں نے کیا کیا؟ — فرصت، کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں، کہ خضر کی ہم پیروی کریں — جانا، کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار! دیکھنا! — تم کو کہیں، جو غالبِ آشفتہ سر ملے

(۴۲)

ظلمت کدے میں میرے، شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال — مدت ہوئی، کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب — اے شوق! یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست — بزمِ خیال، میکدۂ بے خروش ہے

ق اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل! — زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے، کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر، تو بزم میں — نے وہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں، خیال میں — غالبؔ: صریرِ خامہ، نوائے سروش ہے

(۴۳)

بے اعتدالیوں سے، سبک سب میں ہم ہوئے — جتنے زیادہ ہو گئے، اتنے ہی کم ہوئے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے — اڑنے نہ پائے تھے، کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری، اپنی فنا پر دلیل ہے — یاں تک مٹے، کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

سختی کشانِ عشق کی، پوچھے ہے کیا خبر؟ — وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں — تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

چھوڑی اسدؔ! نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے، تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

(۴۴)

آہ کو میری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنّت، حیاتِ دہر کے بدلے
نشّہ، بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو
ہائے! کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

دل سے عبث ہے، گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عشّاق کی غبار نہیں ہے

دل سے اُٹھا، لطفِ جلوہ ہائے معانی
غیرِ گُل، آئینۂ بہار نہیں ہے

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے
وائے! اگر عہد اُستوار نہیں ہے

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ!
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

(۴۵)

جس بزم میں، تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں، کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اِس قدِ دل کش سے، جو گلزار میں آوے

تب نازِ گراں مائگیِ اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خوں بار میں آوے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت، کہ ستم گر!
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اُس چشمِ فسوں گر کا، اگر پائے اِشارہ
طوطی کی طرح آئنہ گفتار میں آوے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب!
اِک آبلہ پا، وادیِ پُرخار میں آوے

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گُل، باغ سے، بازار میں آوے؟

آتش کدہ ہے سینہ مرا، رازِ نہاں سے
اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ! مرے اشعار میں آوے

(۴۶)

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا! جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں، اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے نا اُمیدی! کیا قیامت ہے؟
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

تکلّف برطرف، نظارگی میں بھی سہی، لیکن
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پانو پہلے ہی نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے، کہ ہووے مدّعی کا ہم سفر، غالبؔ!
وہ کافر، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

(۴۷)

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا، مرے آگے

اِک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اِک بات ہے اعجازِ مسیحا، مرے آگے

جز نام، نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم، نہیں ہستیِ اشیا، مرے آگے

مت پوچھ، کہ کیا حال ہے میرا؟ ترے پیچھے
تو دیکھ، کہ کیا رنگ ہے تیرا؟ مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گُل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا، مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے، میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں، لو نام نہ اُن کا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ، مرے آگے

خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنّا، مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا، مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالبؔ کو بُرا کیوں کہو؟ اچھا، مرے آگے

(۴۸)

نہ گُلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو اور آرایشِ خمِ کاکُل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

لافِ تمکیں، فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گُداز

ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیّاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سر بہ سر انداز

تو ہُوا جلوہ گر، مُبارک ہو!
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

اسد اللہ خاں تمام ہوا | اے دریغا! وہ رندِ شاہد باز

(۴۹)

درخورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا نہ ہوا | پھر غلط کیا ہے؟ کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں، کہ ہم | اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں | تیرا بیمار، بُرا کیا ہے؟ گر اچھا نہ ہوا
سینہ کا داغ ہے وہ نالہ، کہ لب تک نہ گیا | خاک کا رزق ہے وہ قطرہ، کہ دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے وہ دکھ، کہ کسی کو نہ ملا | کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا
قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے، اور جزو میں کُل | کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا
تھی خبر گرم، کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے | دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

(۵۰)

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کُھلا | رکھیو یارب! یہ درِ گنجینۂ گوہر کُھلا
گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب؟ | آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کُھلا
گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں، گو نہ پاؤں اُس کے بھید | پر یہ کیا کم ہے، کہ مجھ سے وہ پری پیکر کُھلا
ہے خیالِ حُسن میں، حُسنِ عمل کا سا خیال | خُلد کا اِک در ہے میری گور کے اندر کُھلا
منھ نہ کُھلنے پر ہے وہ عالم، کہ دیکھا ہی نہیں | زُلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منھ پر کُھلا
کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول | آج اُدھر کو ہی رہے گا دیدۂ اختر کُھلا

(۵۱)

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا | یاں، ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے | یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا
تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز | میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں | طُعمہ ہوں ایک ہی نفَسِ جاں گداز کا
ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے | ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا، کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض، اُس گرہِ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہُوا، اسدؔ!
سینہ، کہ تھا دفینہ گُہر ہائے راز کا

(۵۲)

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یا رب! اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصوّر
دل میں نظر آتی تو ہے اِک بوند لہو کی

کیوں ڈرتے ہو عُشّاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سُنتا نہیں فریاد کِسو کی

دشنے نے کبھی مُنھ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پُوچھی ہو گلُو کی

صد حیف! وہ ناکام، کہ اِک عُمر سے غالبؔ!
حسرت میں رہے ایک بُتِ عربدہ جُو کی

(۵۳)

دیکھ کر دَر پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عُریانی مجھے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا مِن جُملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے؟

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاراں، واہ، واہ!
پھر ہُوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے ازسرِ نَو زندگی
میرزا یُوسف ہے، غالبؔ! یُوسفِ ثانی مجھے

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو، کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

وہ آئے گھر میں ہمارے، خُدا کی قُدرت ہے
کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازُو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں؟

ترے جواہرِ طرفِ کُلہ کو کیا دیکھیں؟
ہم اَوجِ طالعِ لعل و گُہر کو دیکھتے ہیں

نہ تھا کچھ تو خُدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خُدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا؟

ہُوا جب غم سے یُوں بے حس، تو غم کیا سر کے کٹنے کا؟
نہ ہوتا گر جُدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا
ہُوئی مدّت، کہ غالبؔ مرگیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اِک بات پر کہنا، کہ یُوں ہوتا تو کیا ہوتا؟

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
ہر چند، ہر ایک شئے میں تُو ہے
پر تجھ سی کوئی شئے نہیں ہے
ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

تُم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پُوچھتے رہو، تو کیا گُناہ ہو؟
جب مے کدہ چُھٹا، تو اب کیا جگہ کی قید؟
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
سُنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب دُرست
لیکن خدا کرے، کہ تری جلوہ گاہ ہو

وفاداری بہ شرطِ اُستواری، اصلِ ایماں ہے
مرے بُت خانے میں، تو کعبے میں گاڑو برہمن کو
نہ لُٹتا دِن کو، تو کب رات کو یُوں بے خبر سوتا؟
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو
خُدا شرمائے ہاتھوں کو، کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو

غمِ دُنیا سے گر پائی بھی فُرصت سر اُٹھانے کی
فلک کا دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی
ہماری سادگی تھی اِلتفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم! مگر تمہید جانے کی
کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ!
بدی کی اُس نے، جِس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مُصوّری
تقریب کُچھ تو بہرِ مُلاقات چاہیے
ہے رنگِ لالہ و گُل و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اِثبات چاہیے
مَے سے غرض نشاط ہے کِس رُوسیاہ کو؟
اِک گُونہ بے خودی مجھے دِن رات چاہیے

کیوں کر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز! کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز؟
تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ! واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں، ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے غالبؔ کو بُرا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اُتر جاوے نگاہِ ناز کو، پھر کیوں نہ آشنا کہیے
نہیں ذریعۂ راحت، جراحتِ پیکاں وہ زخمِ تیغ ہے، جس کو کہ دل کُشا کہیے

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے ولے، مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے
پلا دے اوک سے ساقی! جو مجھ سے نفرت ہے پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے انجمن بے شمع ہے، گر برق خرمن میں نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے، چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو، ستم گر ورنہ کیا قسم ہے ترے ملنے کی؟ کہ کھا بھی نہ سکوں؟

دونوں جہان دے کے، وہ سمجھے، یہ خوش رہا یاں آ پڑی یہ شرم، کہ تکرار کیا کریں؟
تھک تھک کے، ہر مقام پہ دو چار رہ گئے تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

نہیں معلوم، کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا قیامت ہے، سرشک آلود ہونا تیری مژگاں کا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا   یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گُل ہے   چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

مَیں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں؟   گر مَیں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہُوا تھا؟

سُرمۂ مُفتِ نظر ہُوں، مری قیمت یہ ہے   کہ رہے چشمِ خریدار پہ اِحساں میرا

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی، تو ویراں ہوتا   بحر، گر بحر نہ ہوتا، تو دریا ہوتا

بُلبُل کے کاروبار پہ، ہیں خندہ ہائے گُل   کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا

آئنہ دیکھ، اپنا سا مُنھ لے کے رہ گئے   صاحِب کو دِل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

مَیں اور اِک آفت کا ٹکڑا وہ دِلِ وحشی کہ ہے   عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے؟   شرمندگی سے عُذر نہ کرنا گناہ کا

لطافت، بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی   چمن زنگار ہے آئنۂ بادِ بہاری کا

نہ لڑنا ناصح سے، غالبؔ! کیا ہوا، گر اُس نے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

اسدؔ بسمِل ہے کِس انداز کا؟ قاتِل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر

ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو؟ غالبؔ!
قسمت میں ہے مرنے کی تمنّا کوئی دِن اور

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن، شمعِ ماتم خانہ ہم

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو؟

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد!
کُھلا یہ، فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

زمانہ سخت کم آزار ہے، بہ جانِ اسد!
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش، ولے
غالب! یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

ترے سروِ قامت سے اِک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا! نہ مانگ

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

ہر اک مکان کو، ہے مکیں سے شرف، اسد!
مجنوں جو مر گیا ہے، تو جنگل اداس ہے

خزاں کیا؛ فصلِ گل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ؟
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

زندگی اپنی جب اِس شکل سے گزری، غالب!
ہم بھی کیا یاد کریں گے؟ کہ خدا رکھتے تھے

ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ، غالب!
ہم بیاباں میں ہیں، اور گھر میں بہار آئی ہے

دیکھنا تقریر کی لذت، کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا، کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

رکھیو غالبؔ! مجھے اِس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نااُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اِک نگہ، کہ بہ ظاہر نگاہ سے کم ہے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ!
کسی سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے؟

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ!
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے
دیکھوں، اب مر گئے، پر کون اُٹھاتا ہے مجھے؟

نکلنا خلد سے آدم کا سُنتے آئے تھے، لیکن
بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا!
افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

غالبؔ! بُرا نہ مان، جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے؟ کہ سب اچھا کہیں جسے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! یہ اگر کردہ گناہوں کی سزا ہے

رگِ پے میں جب اُترے زہرِ غم تو دیکھیے کیا ہو؟
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

حالی ۔ خواجہ الطاف حسین

ولادت ۱۸۳۷ء
وفات ۱۹۱۴ء

قلق اور دل میں سوا ہو گیا ‏ ‏ دلاسا تمھارا ، بلا ہو گیا
وہ اُمید کیا ؛ جس کی ہو انتہا ‏ ‏ وہ وعدہ نہیں ، جو وفا ہو گیا
ہُوا رُکتے رُکتے دم آخر فنا ‏ ‏ مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا
نہیں بھولتا اُس کی رُخصت کا وقت ‏ ‏ وہ رو رو کے مِلنا ، بلا ہو گیا
سماں کل کا ، رہ رہ کے آتا ہے یاد ‏ ‏ ابھی کیا تھا ؟ اور کیا سے کیا ہو گیا ؟
ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال ‏ ‏ کہیں ، سادہ دِل مُبتلا ہو گیا

(۲)

اب وہ اگلا سا التفات نہیں ‏ ‏ جس پہ بھولے تھے ، اب وہ بات نہیں
رنج کیا کیا ہیں ؛ ایک جان کے ساتھ ‏ ‏ زِندگی موت ہے ، حیات نہیں
یوں ہی گزرے تو سہل ہے ، لیکن ‏ ‏ فُرصتِ غم کو بھی ثبات نہیں
کوئی دِل سوز ہو ، تو کیجے بیاں ‏ ‏ سرسری دِل کی وارِدات نہیں
قیس ہو ، کوہکن ہو یا حالی ‏ ‏ عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

(۳)

آپ کچھ کہہ کے جو ہم جتانے لگے ‏ ‏ آپ کچھ کہہ کے مُسکرانے لگے
ڈر ہے ، میری زبان نہ کھل جائے ‏ ‏ اب وہ باتیں بہت بنانے لگے
تم کو کرنا پڑے گا عُذرِ جفا ‏ ‏ ہم اگر دردِ دِل سُنانے لگے
سخت مُشکل ہے شیوۂ تسلیم ‏ ‏ ہم بھی آخر کو جی چُرانے لگے
وقتِ رُخصت تھا سخت حالی پر ‏ ‏ ہم بھی بیٹھے تھے ، جب وہ جانے لگے

(۴)

وصل کا اُس کے ، دِلِ زار تمنائی ہے ‏ ‏ نہ مُلاقات ہے جس سے ، نہ شناسائی ہے

قطعِ امید نے دل کر دیے یک سو، صد شکر
شکل مدت میں یہ اللہ نے دکھلائی ہے

ڈر نہیں غیر کا، جو کچھ ہے، سو اپنا ڈر ہے
ہم نے جب کھائی ہے، اپنے ہی سے زک کھائی ہے

نظر آتی نہیں اب دل میں تمنا کوئی
بعد مدت کے تمنا مری بر آئی ہے

(۵)

ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر، کر چکے
آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے

اے دل! اب آزمائشِ تقدیر کا ہے وقت
وہ امتحانِ گردشِ شمشیر کر چکے

کہتے ہیں؛ طبعِ دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے

دل لے کے ایک میرا، یہ فارغ ہوئے ہیں وہ
گویا کہ اک جہاں کو تسخیر کر چکے

حالی! اب آؤ پیرویِ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

(۶)

ہے جستجو، کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں؟
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے! جا کر نظر کہاں؟

یا رب! اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط، مگر اس قدر کہاں؟

اک عمر چاہیے، کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں؟

ہم جس پہ مر رہے ہیں، وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں؟

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو، تو دعا میں اثر کہاں؟

حالی! نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب!
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں؟

(۷)

اس کے جاتے ہی، یہ کیا ہو گئی؛ گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے، نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل؟
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

ہے غمِ روزِ جدائی، نہ نشاطِ شبِ غم
ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

شوق میں اس کے مزا، درد میں اس کے لذت
ناصحو! اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

اُن کو حالیؔ بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

(۸)

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بُتاں سے ہم — سب کچھ کہا، مگر نہ کھلے رازداں سے ہم
اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بُتاں سے ہم — کچھ دِل سے ہیں ڈرے ہوئے، کچھ آسماں سے ہم
دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں — تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم
اب شوق سے، بگاڑ کی باتیں کیا کرو! — کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم

(۹)

ننگِ گراں ہے راہ میں تمکینِ یار کا — اب دیکھنا ہے زور، دلِ بے قرار کا
اِک خو سی ہو گئی ہے تحمّل کی ورنہ اب — وہ حوصلہ نہیں رہا صبر و قرار کا
آؤ! مٹا بھی دو! خلشِ آرزوئے قتل — کیا اِعتبار؟ زِندگیِ مُستعار کا؟
ہم خوش کبھی ہوئے ہوں، تو غم ناگوار ہو — مِلتا نہیں محل گِلۂ روزگار کا
سمجھو مجھے، اگر تمھیں ہے آدمی کی قدر — میرا اِک اِلتفات، نہ مرنا ہزار کا

(۱۰)

کہہ دو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے — گر مے نہیں، دے زہر ہی کا جام، بلا سے
جو کچھ ہے، سو ہے اُس کے تغافل سے شکایت — قاصِد سے ہے تکرار، نہ جھگڑا ہے صبا سے
جد گزرے دوا سے تو بھروسہ پہ دُعا کے — ق در گزریں دُعا سے بھی، دُعا ہے یہ خُدا سے
اِک درد ہو بس آٹھ پہر دِل میں، کہ جس کو — تخفیف دوا سے ہو، نہ تسکین دُعا سے
حالیؔ! دلِ اِنساں میں ہے گم دولتِ کونین — شرمندہ ہوں، کیوں غیر کے احسان و عطا سے؟

(۱۱)

کل مُدّعی کو آپ پہ کیا کیا گُماں رہے؟ — بات اُس کی کاٹتے رہے، اور ہم زباں رہے
یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو، یا درمیاں رہے
حالی کے بعد کوئی نہ ہم درد پھر ملا — کچھ راز تھے، کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

(۱۲)

دِل سے خیالِ دوست بُھلایا نہ جائے گا — سینے میں داغ ہے، کہ مٹایا نہ جائے گا
تم کو ہزار شرم سہی، مجھ کو لاکھ ضبط — اُلفت وہ راز ہے، کہ چھپایا نہ جائے گا
راضی ہیں، ہم کو دوست سے ہو دشمنی، مگر — دشمن کو، ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا
بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں؟ جانتے ہیں وہ — ہم وہ نہیں، کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

(۱۳)

تھا آفتِ جاں، اُس کا اندازِ کماں داری — ہم بچ کے کہاں جاتے؟ گر تیر خطا ہوتا
ہم روزِ وداع اُس سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت — رونا تھا بہت ہم کو، روتے بھی تو کیا ہوتا؟
جو دِل پہ گزرتی ہے، کیا تجھ کو خبر، ناصح! — کچھ ہم سے سُنا ہوتا، پھر تُو نے کہا ہوتا
جو جان سے در گزرے، وہ جاہے سو کر گزرے — گر آج نہ تم آتے، کیا جانیے؟ کیا ہوتا؟
کل حالیِ دیوانہ، کہتا تھا کچھ افسانہ — سُننے ہی کے قابِل تھا، تم نے بھی سُنا ہوتا

(۱۴)

پیش از ظہورِ عشق، کسی کا نشاں نہ تھا — تھا حُسن میزباں، کوئی مہماں نہ تھا
ملتے ہی اُن کے؛ بھول گئیں کلفتیں تمام — گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
رات اُن کو بات بات پہ، سو سو دیئے جواب — مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا
کیا ماننے تھے؟ جانے گا جی اک نگاہ میں — تھی دِل کو احتیاط، مگر ہم جان نہ تھا

جانتا ہے وہی، ہے دِل پہ گزرتی جس کے — ہم کہیں کس سے؟ کہ درپیش ہے حالت کیسی؟
ہم نے اوّل سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر تک — ہم سے پوچھے کوئی، ہوتی ہے محبت کیسی؟
نظر آتا تھا یہ پہلے ہی سے حالی! اب ہم — یار نے، ہم بھی کہوں، ہے یہ عنایت کیسی؟

چھپ چھپاتے اُسے دے آئے دِل اِک بات پہ ہم — حال ہنستا نظر آتا، تو چھپایا جاتا
اُس نے اچھا ہی کیا، حال نہ پوچھا دِل کا — بھڑک اُٹھتا، تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا
عشق سُنتے تھے جسے ہم، وہ یہی ہے شاید — خود بخود دِل میں ہے اِک شخص سمایا جاتا

شوق بڑھتا گیا، جوں جوں رُکے اُس شوخ سے ہم — یہ سبق وہ ہے، کہ بھولے سے، ہوا یاد رہے
یاد آؤ گے بہت، لُطف سمجھ کر کیجے — اِس بھلائی کا ہے انجام بُرا، یاد رہے
شیخ! یاں شرمِ گنہ، شوق بھلا دیتا ہے — توبہ اُن کی ہے، جنھیں اپنی خطا یاد رہے

رنج، اور رنج بھی تنہائی کا — وقت پہنچا مری رُسوائی کا
غم، شاید نہ کرے آج وفا — کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا

آنے لگا جب اُس کی تمنا میں کچھ مزا! — کہتے ہیں لوگ، جان کا اِس میں زیاں ہے اب
لغزش نہ ہو، بلا ہے حسینوں کا التفات — اے دل، سنبھل! وہ دشمنِ دیں مہرباں ہے اب

عہدِ وصال، دِل نے بھلایا نہیں ہنوز — عالم مری نظر میں سمایا نہیں ہنوز
کیا دِل سے بعدِ مرگ بھی جاتی نہ تیری یاد؟ — بھولے ہمیں، کہ تجھ کو بھلایا نہیں ہنوز

رہا ہوں رِند بھی اے شیخ! پارسا بھی میں — مری نگاہ میں ہے رِند و پارسا ایک ایک
وہ عشق ہے نہ جوانی، وہ تو ہے اب نہ وہ ہم — پہ، دل پہ نقش ہے تیری ادا ایک ایک

یارب! طلبِ وصل ہو یا ہو طربِ وصل — جس دِن کہ یہ دونوں نہ ہوں، وہ دِن نہ دِکھانا

کوئی ہمدم نہیں مِلتا جہاں میں مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

مجھے ڈالا ہے سو وہم و گماں میں بہت کچھ آج مجھ پر مہرباں ہو
تقاضائے محبّت ہے وگر نہ مجھے، اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

ضبط کیجے دردِ دل، تو ضبط کی طاقت نہیں
اور کھلا جاتا ہے رازِ دل، اگر اُف کیجیے

اور اعتبار کھوتے ہو اپنا، رہا سہا بس آگیا یقیں ہمیں، قسمیں نہ کھائیے!

ہے وہ دیر آشنا تو عیب ہے کیا؟ مرتے ہیں ہم اِنھیں اداؤں پر

گو مے ہے تند و تلخ پہ ساقی ہے دِلرُبا اے شیخ! بس پڑے گی نہ کچھ ہاں کہے بغیر

رنجش و اِلتفات و ناز و نیاز ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز

دِیں غیر دشمنی کا ہماری خیال چھوڑ یاں دشمنی کے واسطے کافی ہے یار، بس!

کیوں بڑھاتے ہو اِختلاط بہت؟ ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ، محتسب! بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ، یاں سزا کے بعد

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں — کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
ہوں اُس کوچہ کے ہر ذرہ سے آگاہ — اُدھر سے مدتوں آیا گیا ہوں
دلِ مضطر سے پوچھ، اے رونقِ بزم! — مَیں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں
نہیں اُٹھتے قدم کیوں جانبِ دَیر؟ — کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں
نہ تھا مَیں معتقد اعجازِ مَے کا — بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں
کجا مَیں، اور کجا اے شاد! دُنیا؟ — کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں؟

(۲)

نگہ کی برچھیاں جو سہہ سکے، سینا اُسی کا ہے — ہمارا آپ کا جینا نہیں، جینا اُسی کا ہے
یہ بزمِ مَے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی — جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں، مینا اُسی کا ہے
مکدّر یا مصفّا، جس کو یہ دونوں ہی یکساں ہوں — حقیقت میں وہی مے خوار ہے، پینا اُسی کا ہے
اُمیدیں جب بڑھیں حد سے، طلسمی سانپ ہیں زاہد! — جو توڑے یہ طلسم اے دوست! گنجینا اُسی کا ہے
کدورت سے دِل اپنا پاک رکھ اے شاد! پیری میں — کہ جس کو منہ دکھانا ہے، یہ آئینہ اُسی کا ہے

(۳)

اب بھی اِک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا — زندگی! چھوڑ دے پیچھا مرا، مَیں باز آیا
لے رہا ہے درِ مے خانہ پہ سن گن واعظ — رندو! ہشیار! کہ اِک مفسدہ پرداز آیا
اشک آنکھوں میں مری دیکھ کے ہنس دیتے ہیں — دوستو! مجھ کو خجل کرنے وہ غماز آیا
چین دے گا نہ مجھے، تازہ اسیری کا خیال — دھیان اُس کا نہ بجھے، حسرتِ پرواز! آیا
رند پھیلائے ہیں چلّو کو، تکلّف کیسا؟ — ساقیا! ڈھال بھی دے، جامِ خدا ساز آیا
اِک خموشی میں، گلو! تم نے نکالے سب کام — غمزہ آیا، نہ کرشمہ، نہ تمھیں ناز آیا
کہتے ہیں شعر کسے؟ بزم پہ کھل جائے گا — شاد آیا نہ کہو! حافظِ شیراز آیا

۴

سراپا سوز ہے اے دل! سراپا نور ہو جانا
اگر جلنا، تو جل کر جلوہ گاہِ طور ہو جانا

ہمارے زخمِ دل نے دل لگی اچھی نکالی ہے
چھپائے سے تو چھپ جانا، مگر ناسور ہو جانا

خیالِ وصل کو اب آرزو جھولا جھلاتی ہے
قریب آنا دلِ مایوس کے، پھر دور ہو جانا

جو میں ایسا سمجھتا، کچھ تو کرتا فکر جینے کی
برا مرنا نہ مرنا، آپ کا مشہور ہو جانا

نہ دے الزام بدمستی کا، اک افتاد تھی ساقی!
برا گرنا، بھرے ساغر کا چکنا چور ہو جانا

خدا بخشے، دکھا کر اک جھلک یوں ہی سی آنکھوں کو
قیامت ہے، جوانی کا مری کافور ہو جانا

جلا دے دل، اگر رندوں کے ٹوٹے، رنج کیا اس کا؟
شگونِ نیک ہے، شیشے کا ساقی! چور ہو جانا

شبِ وصل، اپنی آنکھوں نے عجب اندھیر دیکھا ہے
نقاب ان کا الٹنا، رات کا کافور ہو جانا

جو سچ پوچھو، تو شاد! اپنے کیے کچھ بھی نہیں ہوتا
خدا کی دین ہے، انسان کا مشہور ہو جانا

۵

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کو نہیں، نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم، اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

اے شوق! بھلا کچھ تو ہی بتا، اب تک یہ کرشمہ کچھ نہ کھلا
ہم میں ہے دلِ بے تاب نہاں، یا آپ دلِ بے تاب ہیں ہم؟

میں حیرت و حسرت کا مارا، خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے، آ، کچھ بھی نہیں، پایاب ہیں ہم

ہو جائے بکھیڑا پاک کہیں، پاس اپنے بلا لیں، بہتر ہے
اب دردِ جدائی سے ان کی، اے آہ! بہت بے تاب ہیں ہم

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں، منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ! قدر کرو، نایاب نہ ہوں، کم یاب ہیں ہم

مُرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شادؔ! یہ کہلا بھیجا ہے
آجاؤ، جو تم کو آنا ہو، ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

(۶)

اگر مرتے ہوئے لب پر نہ تیرا نام آئے گا ۔۔۔ تو میں مرنے سے درگزرا، مرے کس کام آئے گا؟
شبِ ہجراں کی سختی ہو تو ہو، لیکن یہ کیا کم ہے؟ ۔۔۔ کہ لب پر رات بھر رہ رہ کے تیرا نام آئے گا
کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوبؑ اے ساقی! ۔۔۔ خُم آئے گا، صُراحی آئے گی، تب جام آئے گا
ابھی اُمید پر باندھے ہوئے ہیں ٹکٹکی مے کش ۔۔۔ کفِ نازک پہ اِک دِن رکھ کے ساقی جام آئے گا
یہاں دِل پر بنی ہے، تجھ سے اے غم خوار! کیا اُلجھوں ۔۔۔ یہ کون آرام ہے؟ مرجاؤں تب آرام آئے گا
اُنھیں دیکھے گی تو اے چشمِ پرنم! وصل میں، یا میں ۔۔۔ ترے کام آئے گا رونا؟ کہ میرے کام آئے گا؟
یہی کہہ کر اجل کو قرض خواہوں کی طرح ٹالا ۔۔۔ کہ دے کر آج قاصد یار کا پیغام آئے گا

(۷)

باغِ بہشت کا سماں، دل کو یہیں دِکھا دِیا ۔۔۔ اُس کی زباں پہ ہم نثار، جس نے ترا پتا دیا
بزمِ نشاطِ دوستاں تیرہ و تار ہو گئی ۔۔۔ گُل کے چراغِ عمر کو، کس نے؟ صبا! بُجھا دِیا
جتنے تھے اپنے غم گسار، اِس شبِ تارِ ہجر میں ۔۔۔ پہلے ہی اے فسانہ گو! تو نے اُنھیں سُلا دِیا
اور تو کچھ گلا نہیں، شکوہ یہ ہے کہ دے کے عقل ۔۔۔ دشمنِ جان و آبرو، ساتھ مرے لگا دِیا
دِل تھا بھرا ہوا بہت، تنگ تھا اپنا حوصلہ ۔۔۔ اپنی سی کہہ تو دی مگر، سُن کے وہ مُسکرا دِیا
اب نہ پلٹ کے آئے گی، عمرِ عزیز، شادؔ! حیف! ۔۔۔ دولتِ لازوال تھی، تو نے جسے گنوا دِیا

(۸)

لے کے خود پیرِ مُغاں، ہاتھ میں مینا آیا ۔۔۔ مے کشو! شرم، کہ اِس پر بھی نہ پینا آیا
دِل نے دیکھا مجھے، اور میں نے فلک کو دیکھا ۔۔۔ بچ کے ساحل پہ اگر کوئی سفینا آیا
کس بدمست کی یاد آ گئیں آنکھیں ساقی! ۔۔۔ جب چھلکتا ہوا، آگے مرے مینا آیا
چاہا جو کچھ، وہ زمانے نے کیا نقش اُس پر ۔۔۔ میں تو سادہ لیے اِس دل کا نگینا آیا

دیکھ چاروں طرف اپنے، کہ تماشا کیا ہے؛ لے کے اس بزم میں تو دیدۂ بینا آیا

(۹)

وہ آہ کیا؟ جو زباں تک نہ لائے نام ترا
وہ درد کب ہے؟ جو دِل کو نہ دے پیام ترا

خوشا وہ سینہ، وہ دِل، جس میں ہو مقام ترا
خوشا! وہ لب کہ رہے وِرد جس کے نام ترا

میں دِل سے اُس کے قلم پر نثار ہوتا ہوں
رِضا کے نام کو اپنے، جو لکھے جو نام ترا

سمجھ سمجھ کے بڑھا دستِ آرزو، اے دوست!
نہ مے کدہ، نہ صُبُوحی، نہ خُم، نہ جام ترا

شبِ فِراق کے جاگے: تجھے مُبارک ہو
نسیمِ صُبح وہاں لے چلی پیام ترا

(۱۰)

یہ بارِ عشق ہے، دِل کے سوا اُٹھاتا کون؟
پہاڑ خوف سے اِس بوجھ کے دہل جاتا

حکایتِ لبِ جاں بخش اگر کوئی کہتا
تو کچھ دِنوں ترا بیمار پھر سنبھل جاتا

وہ دو گھڑی کو ٹھہرتے جو اور مقتل میں
تو اک غریب کا بھی حوصلہ نکل جاتا

ہمارے نالۂ سوزاں کا ذِکر کیا؟ اے شادؔ!
اگر قریب ٹھہرتا، تو شب کو جل جاتا

(۱۱)

اب کیا ہُنر کی قدر؟ وہ اہلِ ہُنر گئے
یہ دَور اور ہے، وہ زمانے گزر گئے

خوشبو سے جِن گُلوں کی مہکتے تھے دو جہاں
کیوں اے صبا! وہ پھول چمن سے کِدھر گئے؟

اُس بزم میں کوئی نہ ہُوا باریاب، حیف!
نالے بھی جو نکلے تھے، وہ سب بے اثر گئے

جِن جِن سے اِک خزانۂ قدرت تھا باغِ دہر
اے چرخ! کس خرابے میں؟ وہ اہلِ زر گئے

تو یہ کی یاد آتی ہے کس وقت ساقیا!
دو تین گھونٹ جب کہ گلے سے اُتر گئے

(۱۲)

عاشق ہزار عرض کرے، اِلتجا کرے
وہ بزم میں اگر نہ بُلائیں تو کیا کرے؟

بے مژدۂ وِصال نہ چونکیں ترے شہید
سَو بار اگر فرشتۂ رحمت ندا کرے

اُس کے لیے تو ہاتھ اُٹھانا بھی منع ہے
جس کی دُعا ہوں آپ، وہ کس کی دُعا کرے؟

چالیس ہیں فتنہ خیز زمانے کی، دِل کو شاق — رفتارِ یار جلد قیامت بپا کرے

(۱۳)

بس انتہا ہے کہ بندہ بنا لیا اُس نے — پھر اور چاہتے کیا ہو؟ بشر خُدا ہو جائے
کہے جو غیر، تو کہتے ہیں شُکر کرتا ہے — وہی کلام، اگر میں کہوں، گِلا ہو جائے
رکھوں نہ عرش پہ بھی اپنا پانو، اے ساقی! — اُس آستاں پہ، جو سجدہ کوئی ادا ہو جائے
شبِ فراق سے ڈر، طالبِ اجل! خاموش — یہ بد دُعا، کہیں ایسا نہ ہو، دُعا ہو جائے

(۱۴)

غضب ہے مرتے دم حسرت کا ہونا، دیدۂ تر میں
قیامت ہے، کوئی بے کس جو یوں ڈوبے سمندر میں
بگاڑ اُن سے، عداوت آسماں سے، دُشمنی دِل سے
بنے پھر بات کیوں کر؟ یوں لکھا ہو جب مُقدّر میں
جہنم کی دہکتی آگ دم بھر میں بجھا دوں گا
سمندر باندھ کر لایا ہوں اپنے دیدۂ تر میں
نہ جا کعبہ، نہ بُت خانہ، جو آنا ہو تو گھر میں آ!
کہیں اللہ کا جلوہ نہیں، اور ہے تو اِس گھر میں
گِلہ اے ہمّتِ دِل اپنی محرومی کا ناحق ہے
وہی ہوتا ہے، جو کچھ لکھ دیا، جس کے مُقدّر میں
کرم تیرا، کہ تو نے یاد رکھا ایسی جا، ورنہ
کسی کو پوچھتا ہے کب کوئی میدانِ محشر میں؟

(۱۵)

ستم پرستوں میں یہ زمانہ ہزار کر لے شمار اُن کا
جو اہلِ دِل ہیں، دِلوں میں اُن کے بڑھے گا اعتبار اُن کا

نہاں جو ہوں گے زمیں کے اندر، زمانہ ڈھونڈے گا جن کو اکثر
دکھا رہی ہے ابھی تماشا، جہاں کو، آہ گُل! بہار اُن کا
یہاں کی نیرنگیوں کا عالم، عیاں ہے محفل سے عاشقوں کی
کسی کو ہے یاس، کوئی بے خود، کسی کو ہے انتظار اُن کا
بھویں ہیں پُر خم، کڑی کمانیں، غضب ہیں اُن کے وہ پھر اشارے
یقیں سے پہنچے گا جس ہدف پر، وہ تیر ہوگا دو سار اُن کا

(۱۶)

کہیں کیا! کس قدر ہم چھٹ کے جانِ زار روئے؟   گلے مل کر بہت محرومیِ دیدار سے روئے
تمیزِ حق و باطل، کثرتِ غم میں نہیں رہتی   گلے مل کر، کبھی ناصح، کبھی غم خوار سے روئے
اُمڈ آیا دلِ اُن کا بھی، مرے گردن جھکانے سے   گلے سے میرے مل کر، دیر تک کس پیار سے! روئے
خدا نے کیا اثر بخشا ہے دردانگیز نالوں کو   م
کبھی کی اپنی آزادی جو یاد آئی، تو اے زنداں!   پلٹ کر ہم اسیرِ غم، در و دیوار سے روئے

(۱۷)

صد حیف: کہ مایوس پھرا آتا ہے قاصد   پھر کل کی طرح دیدۂ مشتاق! برس آج
بل جل نہ گیا ہو، کسی واماندہ کا نالہ   کانوں کو بھلی لگتی ہے کیوں بانگِ جرس آج
سرِحدِ عدم آباد کی ملتی ہے یہیں سے   صد شکر کٹے عمر کے چالیس برس آج
تلوار بھی ہے، وہ بھی ہیں، ہم بھی ہوں، قضا بھی   قسمت میں جو ہونا ہے، وہ ہو جائے گا بس آج
کس شان سے آتے ہیں برستے ہوئے بادل   تڑپائے گی پھر ساغر و مینا کی ہوس آج

(۱۸)

فلک نے داب دیے خاک میں، ہنر کیا کیا؟   زمیں نے کھا لیے، پھولے پھلے شجر کیا کیا
ہوا نگاہ کے پردے میں جلوہ گر کیا کیا؟   نہ پوچھ کہ گئی وہ شرگیں نظر کیا کیا
تڑپ کے ہجر کے ماروں کی، خیر! رات کٹی   پڑی ہے یہ، کہ دکھاتی ہے اب سحر کیا کیا

ہمارا جام ہے لبریز، ہم کو کیا پروا؟ — کہ مچ رہا ہے زمانے میں شور و شر، کیا کیا؟
جو مرنے والے بتاتے، تو پوچھتا اے شاؔد! — کہ نفع مرنے میں کیا کیا ہے؟ اور ضرر کیا کیا؟

(۱۹)

رو کے ہے تن میں رُوح کو اِقرار آپ کا — شرمندہ اب ہے موت سے بیمار آپ کا
شکل آپ کی کھنچی ہوئی پاتے ہیں ہر طرف — آئینہ ہے ہر اک در و دیوار آپ کا
آنکھیں اگر ہوں آج، تو باقی ہے آج بھی — کچھ کل پہ منحصر نہیں دیدار آپ کا
کرنے لگا دوا کی جگہ زہر کی تلاش — عاجز ہے اپنی جان سے بیمار آپ کا
اہلِ ہوس نہ ہو، تو نہ ہو، بے ادب تو ہے — عاشق جو نام لیتا ہے ہر بار آپ کا
کرتے تھے یاد غیظ و غضب سے جو شاؔد کو — حاضر ہے سامنے، وہ گنہگار آپ کا

(۲۰)

ہزار مجمعِ خوبانِ ماہ رُو ہو گا — نگاہ جس پہ ٹھہر جائے گی، وہ تُو ہو گا
بنی ہے دل پہ مرے، عرضِ حال کر اے دل! — یہ کیا خیال؟ کہ برہم وہ تند خُو ہو گا
زمانہ گزرے گا رندوں کا اِس بہار میں یوں — کہ لب پہ نام ترا، ہاتھ میں سبو ہو گا
نہ ہو گا خونِ اسیروں کا رائگاں، صیاد! — چمن میں پھول، تو پھولوں میں رنگ و بو ہو گا
کبھی تو آپ کے حسرت زدہ سمجھ لیں گے — کبھی تو موقعِ اظہارِ آرزو ہو گا
جو زیرِ تیغ، رہے تیری یاد، ہے وہ نماز — جو آنسوؤں سے کیا جائے گا، وضو ہو گا

(۲۱)

سر سے پا تک محو ہیں، آسودگانِ کوئے دوست — آرزو دل میں ہے، دل آنکھوں میں، آنکھیں سوئے دوست
اے اجل! مجھ سے خدارا، اِس تعلق کو نہ پوچھ — خاک بھی ہوں گا، مگر آنکھیں رہیں گی سوئے دوست
کس کو قدرت؟ کون سمجھے؟ اِن اشاروں کو بھلا — خلوتِ اسرارِ دل ہے، گوشۂ ابروئے دوست

پیچ میں حیرت زدہ ہیں رہروانِ کوئے شوق
اِک طرف ہے دشتِ وحشت، اِک طرف ہے کوئے دوست

(۲۲)

اسیرِ جسم ہوں، میعادِ قید، لامعلوم
یہ کس گناہ کی پاداش ہے، خدا معلوم

سفر ضرور ہے، اور عذر کی مجال نہیں
مزا تو یہ ہے کہ منزل نہ راستا معلوم

کسی کو حق نہیں اظہارِ نفی کا ورنہ
خلوصِ نیّتِ زہّادِ بے ریا معلوم

سُنی حکایتِ ہستی، تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

طلب کریں بھی، تو کیا شے طلب کریں اے شاد!
ہمیں کو آپ نہیں اپنا مدّعا معلوم

(۲۳)

عالم جو طور کا ہے، وہی دل کے نور کا
دونوں میں فرق پاتے ہیں، نزدیک و دور کا

کس طرح عاشقوں کو نہ دیدار کا ہو شوق؟
افسانہ کب سے سُنتے ہیں؛ موسیٰ و طور کا

دھن ہے یہی، کہ کل نہیں، برپا ہو حشر آج
اللہ رے! اشتیاق دلِ ناصبور کا

ساقی! ترے بغیر اندھیرا ہے بزم میں
اے آفتاب! وقت ہے تیرے ظہور کا

اپنی تو رات کٹ گئی نالوں کے شغل میں
کیسا رہا مزاجِ مبارک حضور کا

دل اپنی طلب میں صادق تھا، گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا، دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا
نالوں کی کشاکش سہ نہ سکا، خود تارِ نفس ہی ٹوٹ گیا
اک عمر سے تھی تکلیف جسے، شب کو وہی قیدی چھوٹ گیا
ہو ہندوے خالِ لب تیرا، یا ترکِ نگہ ہو اے قاتل!
دہلی تھا ہمارا دل شاید، جو آیا، وہ اس کو لوٹ گیا

ہمیں تو اُن کی نہیں کا ملا، نہ ہاں کا پتا
لگائیں اب کسی اُن کے مزاج داں کا پتا

تجھے تو دور سے آمد تری بتاتی تھی
پیام بر! ترے چھپتے ہوئے بیاں کا پتا

پلانے والا رہے سلامت، اُسی کا دل سے ہوں میں دُعا گو
نہ جام کا ساقیا! ہوں ممنوں، نہ مجھ پہ اِحسان ہے سبو کا
کسی کو آب و ہوا مُوافق ہوئی نہ افسوس! اِس چمن کی
ہمیشہ تھے نالہ کش عنادِل، گلوں نے تا عُمر خون تھوکا

عُمر بھر سہتے ہیں کِس طرح جفا؟ کیا جانیں؟ مرنے والے تیرے، مرنے کے سِوا کیا جانیں؟
ہم جلاتے تو اندھیرے میں ہیں آہوں کے چراغ کب بُجھا دے گی زمانے کی ہوا؟ کیا جانیں؟
دِل کی حالت سے تو واقف ہے وہی واقفِ کُل کِس کو کہتے ہیں دُعا؟ شاد دُعا کیا جانیں؟

گِلہ جلوے کا تیرے کیا؟ کہ عالم آشکارا ہے ہمیں رونا تو جو کچھ ہے وہ اپنی کم نگاہی کا
جو مُخلص ہیں، وہ اپنے دوست کے مُنہ پر نہیں کہتے گھٹا دیتا ہے اُلفت کو جتانا خیر خواہی کا

یکسوں ہوں نہ عاشقوں کو اجل سے کراہتیں؟ عُمریں بہت قلیل ہیں، ارماں کثیر ہیں
حائل اگر ہو سدِّ سکندر، تو توڑ دیں فولاد کے نہیں، یہ نگاہوں کے تیر ہیں
آنکھوں کو کھول دیتے ہیں آہٹ سے پانو کی بیمار آپ کے، ابھی درماں پذیر ہیں

مرے پہلو سے آخر اُٹھ گیا غم خوار گھبرا کر بہت مُشکل ہے آ کر بیٹھنا، آشفتہ حالوں میں
چمن میں جا کے ہم نے غور سے اوراقِ گُل دیکھے تمھارے حُسن کی شرحیں لکھی ہیں اِن رِسالوں میں

کہیں جو کچھ، تو اِشارہ یہ ہے، کہ چُپ رہیے رہیں خموش، تو کہتے ہیں، مدعا کہیے
عدو ہے مے کدہ واعظ ہے اور زاہد بھی جب ایک دونوں کی نیت ہے، کس کو کیا کہیے؟

مانا کہ ہے عاشق کے مقدّر میں تڑپنا
مرتے ہی پھر آجاتا ہے آرام کہاں سے ؟

حوروں کی ثنا رِند جو کرتے، تو سند تھی
یہ ذکر بُرا لگتا ہے واعظ کی زباں سے

دریا کو گہر جس نے دیے، پھول چمن کو
مَیں فیض کا طالب ہُوں، اُسی فیضِ رساں سے

کیوں ساقیا! ہماری ہی قسمت کی گھٹ گئی؟
پہنچے جو ہم، تو آئی صدا یہ کہ بٹ گئی

غنچوں کے مُسکرانے پہ کہتے ہیں ہنس کے پھُول
اپنا کرو خیال، ہماری تو کٹ گئی

ماتم کا آج شور ہے، ہمسایہ میں کہیں
بیڑی کسی اسیر کی اے شادؔ! کٹ گئی

نہ دِل اپنا، نہ غم اپنا، نہ کوئی غم گُسار اپنا
ہم اپنا جانتے ہر چیز کو، ہوتا جو یار اپنا

دِل کیا بجھا، کہ ہو گیا اندھیر ہر طرف
گھر بھر میں اے نسیم! یہی اک چراغ تھا

وہی رنگت، وہی خوشبُو، وہی نازک بدنی
پھُول نے نقش اُتارا ہے سراپا تیرا

فرشتے رونے لگے، حشر میں ہُوا کُہرام
ترے شہید کا جب خوُں چکاں کفن دیکھا

زاہد سے جب سُنو تو زباں پر ہے ذکرِ حور
نیّت ہُوئی خراب، تو ایمان کب رہا؟

صانع کو دیکھنا ہے، تو عالم پہ کر نظر
آئینہ، آئینہ ہے، خود آئینہ ساز کا

از بس کہ اِنتظار میں لذّت ہے بے حساب
شکوہ ہے اہلِ ذوق کو عُمرِ قلیل کا

نہ جاں میری، نہ دِل میرا، خوشی میری، نہ غم میرا
مجھے اے زِندگی! آزاد کر، گھٹتا ہے دم میرا

میری لغزش دیکھ کر ساقی نے پکڑے میرے ہاتھ
جرم میرا، میری بخشش کا وسیلا ہو گیا

ارماں جی کا جی میں رہا، واہ رے نصیب!
تیرِ نگاہ، دِل سے مِرے پار ہو گیا

کیوں شادؔ! کیا اسی کا تمھیں انتظار تھا؛ آئی جو موت، دفعتہً آرام ہو گیا

نگہ کار تری، ساتھ چھوڑا نہ دل نے کہیں تیر جائے، نشانہ یہی تھا

پروانے کی بساط ہی کیا تھی؛ فنا ہُوا دیکھا تو شمع بھی نہ رہی اپنے حال میں

نہ پُوچھو حال میرا، دوستو! اندوہگیں ہوں میں یہ ہونا بھی کوئی ہونے میں ہونا ہے؟ نہیں ہُوں میں

نصیب سب کو ہو یارب! اسی طرح کی موت کہ پا ُئنتی ہے اجل، وہ مرے سرہانے ہیں

وہ پُوچھتے ہی رہ گئے وجہِ ملال و غم ہم سوچتے رہے، کہیں اِس میں گِلا نہ ہو

خود اپنے بس میں رہے، یا تڑپ کے مر جائے جہاں میں آدمی اپنی سی کچھ تو کر جائے

بڑی امید رکھتا ہُوں تری مُشکل کُشائی سے بہت تنگ آ گیا ہُوں اے اجل! اب میں خُدائی سے

شادؔ! کچھ پُوچھ نہ اِن اہلِ تقدّس کے صِفات صورتیں عقل کی، باتیں وہی نادانوں کی

ٹال دیں گے اُسے مجذوب کی بڑ کہہ کہہ کر باتیں گر ٹھیک بھی ہُوں آپ کے دیوانے کی

سب صبر و سکوں لے جائے گی، کچھ حسرت و غم دے جائے گی
آنے کی جو پُوچھو آئے گی، لیکن شبِ وعدہ نام کی ہے

سُنتا ہُوں خفا بیٹھے ہیں وہ، تیوری پہ ہے بل آنکھیں ہیں چڑھی
خوش کر کے نہ آئے آج اُن کو تو شادؔ ہمارا نام نہیں

خموشی سے مُصیبت اَور بھی سنگین ہوتی ہے تڑپ اے دل! تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے
بظاہر مٹ چکا ہے عشق کا آزار، لیکن پھر طبیعت ہر گھڑی رہ رہ کے کیوں بے چین ہوتی ہے؟

چکبست - پنڈت برج نرائن چکبست

ولادت ۱۸۸۲ء
وفات ۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء

دردِ دِل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی، اور یہی اِنساں ہونا

نو گرفتارِ بلا، طرزِ فغاں کیا جانیں؟
کوئی ناشاد سکھادے اِنھیں نالاں ہونا

رہ کے دُنیا میں ہے، یُوں ترکِ ہوس کی خواہش
جس طرح اپنے ہی سایے سے گُریزاں ہونا

زِندگی کیا ہے؟ عناصِر میں ظہورِ ترتیب
مَوت کیا ہے؟ اِنھیں اجزا کا پریشاں ہونا

ہے مِرا ضبطِ جُنوں، جوشِ جُنوں سے بڑھ کر
ننگ ہے میرے لیے چاکِ گریباں ہونا

(۲)

دِل ہی بُجھا ہُوا ہے، تو لُطفِ بہار کیا؟
ساقی ہے کیا؟ شراب ہے کیا؟ سبزہ زار کیا؟

یہ دِل کی تازگی ہے، وہ دِل کی فسُردگی
اِس گُلشنِ جہاں کی، خِزاں کیا؟ بہار کیا؟

جِس کی قفس میں آنکھ کُھلی ہو مِری طرح
اُس کے لیے چمن کی خِزاں کیا؟ بہار کیا؟

بعدِ فنا فضُول ہے نام و نِشاں کی فِکر
جب ہم نہیں رہے، تو رہے گا مزار کیا؟

اعمال کا طِلسم ہے نیرنگِ روزگار
تقدیر کیا ہے؟ گردِشِ لیل و نہار کیا؟

تفسیرِ حالِ زار ہے بس اِک نِگاہِ یاس
ہو داستانِ درد کا اَور اِختِصار کیا؟

چِھٹکی ہوئی ہے گورِ غریباں پہ چاندنی
ہے بے کسوں کو فکرِ چراغِ مزار کیا؟

(۳)

اُڑا کر صحنِ گُلشن سے، مِٹا کر آشیاں میرا
مِرے سایے کے پیچھے پھر رہا ہے باغباں میرا

مِرے احباب پیش آتے ہیں مُجھ سے بے وفائی کر
وفاداری میں شاید کر رہے ہیں اِمتحاں میرا

ہجومِ بے کسی ہے، شامِ تنہائی ہے اَور مَیں ہُوں
صدائے چارہ گر برہم نہ کر دے یہ سماں میرا

صفائے قلب سے اللہ رے! اِنسان کی عظمت
فرِشتے چُومتے ہیں آ کے سنگِ آستاں میرا

مُجھے دَیر و حرم سے واسطہ کیا؟ رِندِ مشرب ہُوں
وہی ایماں ہے، جو کُچھ کہے پیرِ مُغاں میرا

(۴)

فنا کا ہوش آنا، زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے؟ خمارِ بادۂ ہستی اتر جانا

عروسِ جاں، نیا پیراہنِ ہستی بدلتی ہے
فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گزر جانا

وہ طبعِ یاس پرور نے مجھے چشمِ عقیدت دی
کہ شامِ غم کی تاریکی کو بھی نورِ سحر جانا

وہی قطرہ لہو کا اشک بن کر کر گیا رسوا
جسے ہم نے نمک پروردۂ زخمِ جگر جانا

بہت سودا رہا واعظ! تجھے نارِ جہنم کا
مزہ سوزِ محبت کا بھی کچھ اے بے خبر! جانا

چمن زارِ محبت میں اسی نے باغبانی کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

سدھاری منزلِ ہستی سے کس بے اعتنائی سے
تنِ خاکی کو شاید روح نے گردِ سفر جانا

(۵)

بہار آئی، ترقی پر ہے سودا دم بدم میرا
بڑھا جاتا ہے خود زنجیر کی جانب قدم میرا

لکھا یہ داورِ محشر نے میری فردِ عصیاں پر
یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا

کشاکش ہے امید و یاس کی، یہ زندگی کیا ہے؟
الٰہی! ایسی ہستی سے تو اچھا تھا عدم میرا

دلِ احباب میں گھر ہے، شگفتہ رہتی ہے خاطر
یہی جنت ہے میری اور یہی باغِ ارم میرا

مجھے احباب کی پرسش کی غیرت مار ڈالے گی
قیامت ہے، اگر افشا ہوا رازِ الم میرا

کھڑی تھیں راستہ روکے ہوئے لاکھوں تمنائیں
شہیدِ یاس تھا، نکلا ہے کس مشکل سے دم میرا

زبانِ حال سے یہ لکھنؤ کی خاک کہتی ہے
مٹایا گردشِ افلاک نے جاہ و حشم میرا

(۶)

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا، نہ جینے کا مزا ہوتا

مئے گلرنگ لٹتی، یوں درِ میخانہ وا ہوتا
نہ پینے میں کمی ہوتی، نہ ساقی سے گلا ہوتا

ہزاروں جان دیتے ہیں بتوں کی بے وفائی پر
اگر ان میں سے کوئی باوفا ہوتا تو کیا ہوتا!

اگر دم بھر بھی مٹ جاتی خلش خارِ تمنا کی
دلِ حسرت طلب کو اپنی ہستی سے گلا ہوتا

یہ مانا بے حجابانہ نگاہیں قہر کرتی ہیں
مگر حسنِ حیا پرور کا عالم دوسرا ہوتا

مری بے خودی ہے وہ بے خودی کہ خودی کا وہم و گماں نہیں
یہ سرورِ ساغرِ مے نہیں، یہ خمارِ خوابِ گراں نہیں
یہ حیات عالمِ خواب ہے، نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے
وہی کفر و دیں میں خراب ہے جسے علمِ رازِ جہاں نہیں
وہ زمیں پہ جن کا تھا دبدبہ، کہ بلند عرش پہ نام تھا
انھیں یوں فلک نے مٹا دیا، کہ مزار تک کا نشاں نہیں

دل ہی کی بدولت رنج بھی ہے دل ہی کی بدولت راحت بھی
یہ دنیا جس کو کہتے ہیں دوزخ بھی ہے اور جنت بھی
یا خوفِ خدا یا خوفِ سقر، ہیں دو ہی بیاں ترے واعظ!
اللہ کے بندے! دل میں ترے ہے سوز و گداز محبت بھی

نیند کیا آئے شہادت کے طلب گاروں کو — فکر رہتی ہے، ستم گر نے کسے یاد کیا؟
ڈر گیا نالۂ شب گیر سے میرے، صیاد — شام کو قید کیا، صبح کو آزاد کیا
درِ زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے — وہی آزاد ہے جس نے اسے آباد کیا

زمانے کی محبت پر نہ ہو اے ہمنشیں نازاں! — سنائیں گے تجھے فرصت میں قصے آشنائی کے
یہ وہ غم ہے کہ جس کی پرورش دل خوب کرتا ہے — زباں تک لا نہیں سکتا ہوں شکوے بے وفائی کے

دوستی میں اپنا اپنا حق ادا کرتے رہے — وہ جفا کرتے رہے اور ہم وفا کرتے رہے
اہلِ ہمت منزلِ مقصود تک آ بھی گئے — بندۂ تقدیر قسمت کا گلا کرتے رہے

انھیں یہ فکر ہے ہر دم، نئی طرزِ جفا کیا ہے؟
ہمیں یہ شوق ہے، دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے؟
نیا بسمل ہوں، میں واقف نہیں رسمِ شہادت سے
بتا دے تو ہی اے ظالم! تڑپنے کی ادا کیا ہے؟

شورشِ دیر و حرم سے جب پریشاں ہو گئے — کچھ سمجھ کر، ہم شریکِ بزمِ رنداں ہو گئے
دردِ الفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے — خاک کے پتلے اسی جوہر سے انساں ہو گئے

صحنِ چمن سے دور انھیں باغباں! نہ پھینک — تنکے جو یادگار مرے آشیاں کے ہیں
اک سلسلہ ہوس کا ہے انساں کی زندگی — اس ایک مشتِ خاک کو غم دو جہاں کے ہیں
نقشے لکھے ہوئے ہیں جو فرہاد و قیس کے — کھوئے ہوئے ورق وہ مری داستاں کے ہیں

یہاں تسبیح کا پھندا، وہاں زنّار کا پھندا — اسیری لازمی ہے مذہبِ شیخ و برہمن میں
متاعِ دردِ دل اک دولتِ بیدار ہے مجھ کو — درِ شہوار ہے اشکِ محبت میرے دامن میں

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں — مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے
جو تو کہے تو شکایت کا ذکر کم کر دیں — مگر یقیں ترے وعدوں پہ لا نہیں سکتے

ہر دم ہے طبیعت کو الجھن، اک یاس کا عالم طاری ہے
یہ سانس نہیں اک کانٹا ہے، یہ زیست نہیں بیماری ہے

اہلِ بینش کو تو ہستی میں خدا کی شک ہے — ان پہ حسرت ہے جو بندے کو خدا کہتے ہیں

موت کہتی ہے کہ لبریز ہے پیمانۂ عمر
دوست کہتے ہیں کہ اُمید ابھی باقی ہے

نفاق گبر و مُسلماں کا یوں مِٹا آخر
یہ بُت کو بھول گئے، وہ خُدا کو بھول گئے

اُبھرنے ہی نہیں دیتی یہاں بے مائگی دِل کی
نہیں تو کون قطرہ ہے، جو دریا ہو نہیں سکتا

آپ سے ہم سے ہُوا تھا کبھی پیمانِ وفا
کیجیے ظلم، مگر وہ بھی گھڑی یاد رہے

جب کوئی ظُلم نیا کرتے ہیں، فرماتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہمیں طرزِ ستم یاد نہیں

کیا قیامت ہے کہ اک بوند نہیں پی سکتے
دیکھتا ہوں کہ یہ شیشہ ہے، وہ پیمانہ ہے

اِفشا ہوا نہ جورِ قضا و قدر کا راز
پردہ اُٹھا نہ مصلحتِ کردگار کا

دیکھنا ہیں حُسن کے جلوے تو بُت خانے میں آ
تیرے کعبے میں تو بس واعظ! خُدا کا نام ہے

بے اُڑے گا نشۂ مے آج رندوں کو ضرور
اِک پری شیشے میں ہے یا بادۂ گلفام ہے

ذرّہ ذرّہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتّھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

اصغر - اصغر حسین

ولادت یکم مارچ ۱۸۸۴ء
وفات ۱۹۳۶ء

سکونِ شورشِ پنہاں ہے شغلِ جامہ دری
قرارِ سینۂ سوزاں ہے نالۂ سحری

مزاجِ عشق بہت معتدل ہے ان روزوں
جگر میں آگ دہکتی ہے، آنکھ میں ہے تری

یہ ڈر ہے، ہر بُنِ مُو اب لہو نہ دے نکلے
کچھ ایسے زور پہ ہے آج کاوشِ جگری

تری نگاہ کے صدقے، یہ حال کیا ہے مرا!
کمالِ ہوش کہوں، یا کمالِ بے خبری

نگاہِ ناز کی کیفیتیں ہیں دل میں وہی
کہ روح تن میں ہے، شیشہ میں جس طرح ہو پری

محال تھا کوئی ہوتا یہاں رسوا تیرے
یہ کُل جہان ہے منت پذیرِ کم نظری

(۲)

پھر میں نظر آیا، نہ تماشا نظر آیا
جب تو نظر آیا، مجھے تنہا نظر آیا

اللہ رے! دیوانگیِ شوق کا عالم
اک رقص میں ہر ذرۂ صحرا نظر آیا

اُٹھے عجب انداز سے وہ جوشِ غضب میں
چڑھتا ہوا اک حسن کا دریا نظر آیا

کس درجہ ترا حسن بھی آشوبِ جہاں ہے
جس ذرے کو دیکھا، وہ تڑپتا نظر آیا

تھا لطفِ جنوں دیدۂ خوں نابہ فشاں سے
پھولوں سے بھرا دامنِ صحرا نظر آیا

(۳)

عشوؤں کی ہے، نہ اُس نگہِ فتنہ زا کی ہے
ساری خطا مرے دلِ شورش ادا کی ہے

مستانہ کر رہا ہوں رہِ عاشقی کو طے
کچھ ابتدا کی ہے، نہ خبر انتہا کی ہے

کھلتے ہی پھول باغ میں پژمردہ ہو چلے
جنبشِ رگِ بہار میں موجِ فنا کی ہے

ڈوبا ہوا سکوت میں ہے جوشِ آرزو
اب تو یہی زبان مرے مدعا کی ہے

لطفِ نہانِ یار کا مشکل ہے امتیاز
رنگت چڑھی ہوئی ستمِ برملا کی ہے

(۴)

شعورِ غم نہ ہو، فکرِ مآلِ کار نہ ہو
قیامتیں بھی گزر جائیں، ہوشیار نہ ہو

اُٹھاؤں پردۂ ہستی، جو ہو جہاں نہ خراب — سُناؤں رازِ حقیقت، جو خوفِ دار نہ ہو
ہر اک جگہ تری برقِ نگاہ دوڑ گئی — غرض یہ ہے کہ کسی چیز کو قرار نہ ہو
دکھا دے بےخودیِ شوق! وہ سماں مجھ کو — کہ صبحِ وصل نہ ہو، شامِ انتظار نہ ہو
نگاہِ شوق کو یارائے سیرِ دید نہ ہو — جو ساتھ ساتھ تجلّیِ حُسنِ یار نہ ہو

(۵)

اُس کا وہ قدِ رعنا، اُس پر وہ رُخِ رنگیں — نازک سا سرِ شاخ اک گویا گُلِ تر دیکھا
تُم سامنے کیا آئے، اک طرفہ بہار آئی — آنکھوں نے مری گویا فردوسِ نظر دیکھا
ہر ذرّے میں صحرا کے نظر آئی — لیلیٰ کو بھی مجنوں نے یوں خاک بہ سر دیکھا
مستی سے ترا جلوہ خود عرضِ تماشا ہے — آشفتہ مزاجوں کا یہ کیفِ نظر دیکھا
ہاں، وادیِ ایمن کے معلوم ہیں سب قصّے — موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوقِ نظر دیکھا

(۶)

ترے جلووں کے آگے ہمّتِ شرحِ بیاں رکھ دی — زبانِ بے نگہ رکھ دی، نگاہِ بے زباں رکھ دی
مِٹی جاتی تھی بُلبل جلوۂ گُلہائے رنگیں پر — چُھپا کر کس نے اِن پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی
نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا؟ اے واعظِ ناداں! — ہزاروں بن گئے کعبے، جبیں میں نے جہاں رکھ دی
کرشمے حُسن کے پنہاں تھے، شاید رقصِ بسمل میں — بہُت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغِ خوں فشاں رکھ دی

(۷)

اَسرارِ عشق، ہے دلِ مُضطر لیے ہوئے — قطرہ ہے بےقرار سمندر لیے ہوئے
مَوجِ نسیمِ صُبح کے قُربان جائیے — آئی ہے بُوئے زُلفِ مُعنبر لیے ہوئے
قاتل نگاہِ یاس کی زد سے نہ بچ سکا — خنجر تھے، ہم بھی اک تہِ خنجر لیے ہوئے
تصویر ہے کھنچی ہوئی نازونیاز کی — مَیں سر جھکائے، اور وہ خنجر لیے ہوئے

میں کیا کہوں؟ کہاں ہے محبت؟ کہاں نہیں
رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لیے ہوئے

(۸)

سرگرمِ تجلّی ہو، اے جلوۂ جانانہ! — اُڑ جائے دُھواں بن کر، کعبہ ہو کہ بُت خانہ
یہ دین وہ دُنیا ہے، یہ کعبہ وہ بُت خانہ — اِک اور قدم بڑھ کر، اے ہمّتِ مردانہ!
زاہد کو تعجب ہے، صوفی کو تحیّر ہے — صد رشکِ طریقت ہے یہ لغزشِ مستانہ
اِک قطرۂ شبنم پر خورشید ہے عکس آرا — یہ نیستی و ہستی، افسانہ ہی افسانہ
انداز ہیں جذب اِس میں سب شمعِ شبستاں کے — اِک حُسن کی دُنیا ہے خاکسترِ پروانہ

(۹)

پاتا نہیں جو لذّتِ آہِ سحر کو میں — پھر کیا کروں گا لے کے الٰہی! اثر کو میں
جینا بھی آگیا مجھے، مرنا بھی آگیا — پہچاننے لگا ہوں تمھاری نظر کو میں
وہ شوخیوں سے جلوہ دِکھا کر تو چل دیے — اُن کی خبر کو جاؤں، کہ اپنی خبر کو میں
آہوں نے میری خرمنِ ہستی جلا دیا — کیا مُنھ دِکھاؤں گا؟ تری برقِ نظر کو میں
اصغرؔ! مجھے جنوں نہیں، لیکن یہ حال ہے — گھبرا رہا ہوں دیکھ کے دیوار و در کو میں

(۱۰)

نہ کچھ فنا کی خبر ہے، نہ ہے بقا معلوم — بس ایک بے خبری ہے، سو وہ بھی کیا معلوم؟
ہجومِ شوق میں، اب کیا کہوں! میں کیا نہ کہوں؛ — مجھے تو خود بھی نہیں اپنا مدّعا معلوم
غرض یہ ہے، کسی عنواں کریں تجھے مائل؛ — کرشمہ سازیِ ہر رند و پارسا معلوم
جبینِ شوق کی شوریدگی کو کیا کہیے؛ — دگرنہ عشوہ طرازیِ نقشِ پا معلوم
نکھر کے تو اِسی پردے میں جلوہ آرا ہے — بہارِ لالہ و گُل، شوخیِ صبا معلوم

(۱۱)

مُدّت ہوئی کہ چشمِ تحیّر کو ہے سکوت — اب جُنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں
سارا حصولِ عشق کی ناکامیوں میں ہے — جو عُمر رائیگاں ہے، وہی رائیگاں نہیں
ہوتا ہے رازِ عشق و محبت اِنھیں سے فاش — آنکھیں زباں نہیں ہیں، مگر بے زباں نہیں

دیکھوں، ہجومِ غم میں وہ لے کس طرح خبر؟
یہ اُس کا اِمتحاں ہے، مِرا اِمتحاں نہیں

(۱۲)

کیوں شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار ہوں
اِک تازہ زندگی ہے ہر اِک اِنقلاب میں

وہ موت ہے، کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب
وہ عینِ زندگی ہے، جو ہے اِضطراب میں

اُس دِن بھی میری رُوح تھی محوِ نشاطِ دید
موسیٰ اُلجھ گئے تھے سوال و جواب میں

دوزخ بھی ایک جلوۂ فِردوسِ حُسن ہے
جو اِس سے بے خبر ہیں، وہی ہیں عذاب میں

اِتنا ہُوا، دلیل تو دریا کی بن سکے
مانا کہ اور کچھ نہیں موج و حباب میں

مے خانۂ ازل میں، جہانِ خراب میں
ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

اصغرؔ! غزل میں چاہیے وہ موجِ زندگی
جو حُسن ہے بُتوں میں، جو مستی شراب میں

(۱۳)

آلامِ روزگار کو آساں بنا دِیا
جو غم ہُوا، اُسے غمِ جاناں بنا دِیا

میں کامیابِ دید بھی، محرُومِ دید بھی
جلووں کے اِزدحام نے حَیراں بنا دِیا

یُوں مُسکرائے، جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یُوں لب کُشا ہوئے، کہ گلستاں بنا دِیا

اے شیخ! وہ بسیطِ حقیقت ہے کُفر کی
کچھ قیدِ رسم نے جسے ایماں بنا دِیا

وہ شورشیں، نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مُختصر کِیا اُنھیں اِنساں بنا دِیا

ہم اِس نِگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تُم نے تو مُسکرا کے رگِ جاں بنا دِیا

(۱۴)

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے؟
غُبارِ قیس خود اُٹھتا ہے، خود برباد ہوتا ہے

یہ سب نا آشنائے لذّتِ پرواز ہیں شاید
اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیّاد ہوتا ہے

بہارِ سبزہ و گُل ہے، کرم ہوتا ہے ساقی کا
جواں ہوتی ہے دُنیا، مے کدہ آباد ہوتا ہے

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دِل سے اِک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فِطرتاً آزاد ہوتا ہے

زمانہ ہے کہ خوگر ہو رہا ہے شور و شیون کا
یہاں وہ درد جو بے نالہ و فریاد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں، وہیں صیاد ہوتا ہے

(۱۵)

گلوں کی جلوہ گری، مہر و مہ کی بوالعجبی
تمام شعبدہ ہائے طلسم، بے سببی

گزر گئی ترے مستوں پہ بھی وہ تیرہ شبی
نہ کہکشاں، نہ ثریا، نہ خوشۂ عنبی

یہ زندگی ہے، یہی اصلِ علم و حکمت ہے
جمالِ دوست، شبِ ماہ و خوشۂ عنبی

فروغِ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے
ادا و رسمِ بلالی و طرزِ بوالہبی

ہجومِ غم میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا
کہاں ہے آج تو؟ اے آفتابِ نیم شبی!

سرشتِ عشق طلب اور حسن بے پایاں
حصولِ تشنہ لبی ہے، شدید تشنہ لبی

وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں
جہاں سے تو نے لیے خندہ ہائے زیرِ لبی

کشش نہ جامِ نگاریں کی پوچھ اے ساقی!
چھلک رہا ہے مرا آب و رنگِ تشنہ لبی

(۱۶)

وہ سامنے ہیں، نظامِ حواس برہم ہے
نہ آرزو میں سکت ہے، نہ عشق میں دم ہے

ردائے لالہ و گل، پردۂ مہ و انجم
جہاں جہاں وہ چھپے ہیں، عجیب عالم ہے

نہ اب وہ گریۂ خونیں، نہ اب وہ رنگِ حیات
نہ اب وہ زیست کی لذت، کہ درد بھی کم ہے

خوشا حوادثِ پیہم، خوشا یہ اشکِ رواں
جو غم کے ساتھ ہو تم بھی، تو غم کا کیا غم ہے

کہاں زمان و مکاں پھر؟ کہاں یہ ارض و سما
جہاں تم آئے، یہ ساری بساط برہم ہے

یہاں فسانۂ دیر و حرم نہیں اصغر!
یہ مے کدہ ہے، یہاں بے خودی کا عالم ہے

جانتے ہیں وہ ادائیں اس دلِ بیتاب کی
ان سے بڑھ کر کون ہوگا؟ نکتہ دانِ اضطراب

ناصحِ مشفق! مگر یوں ہی تڑپنے دے مجھے
مجھ کو بھی معلوم ہے سوز و زبانِ اضطراب

دونوں عالم کو تہ و بالا نہ کر ڈالیں کہیں
آپ کا اندازِ شوخی، میری شانِ اضطراب

میں سر سے پا تک ہوں مے پرستی، تمام شورش، تمام مستی
کھلا ہے مجھ پہ یہ رازِ ہستی، کہ کچھ بھی مجھ کو خبر نہیں ہے
بڑا ہے کیا اُس کے در پہ اصغرؔ، وہ شوخ مائل بہ امتحاں ہے
ثبوت دے زندگی کا مر کر، نیاز اب کارگر نہیں ہے

ہنگامۂ مستی، یہ فکرِ فلک پیما — ایک ایک ستارے کو آئینہ دکھا آئی
بیدار ہوا منظر، اُس مست خرامی سے — غنچوں کی کھلیں آنکھیں، دامن کی ہوا آئی
اِک شورِ "انا لیلیٰ" خلقت نے سنا لیکن — پھر نجد کے صحرا سے کوئی نہ صدا آئی

گم کر دیا ہے دید نے یوں سر بہ سر مجھے — ملتی ہے کچھ اُنھیں سے اب اپنی خبر مجھے
مستِ شباب وہ ہیں، میں سرشارِ عشق ہوں — میری خبر اُنھیں ہے، نہ اُن کی خبر مجھے

ہوش پر بجلی گری، آنکھیں بھی خیرہ ہو گئیں — تم تو کیا تھے؟ اِک جھلک سی تھی تمھاری یاد کی
دل ہوا مجبور جس دم، اشکِ حسرت بن گیا — روح جب تڑپی تو صورت بن گئی فریاد کی

اے پیکرِ محبوبی! میں کس سے تجھے پوچھوں؟ — جس نے تجھے دیکھا ہے، وہ دیدۂ حیراں ہے
سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا — جب آنکھ کھلی، دیکھا، اپنا ہی گریباں ہے

طوفِ حرم میں، یا سرِ کوئے بتاں رہے — اِک برقِ اضطراب رہے، ہم جہاں رہے
میں رازدارِ حسن ہوں، تم رازدارِ عشق — لیکن یہ امتیاز بھی کیوں درمیاں رہے

کیا ہوا سازِ دل وہ ٹوٹا سا؟ — ساری ہستی ہے گوش بر آواز

شیشے میں موجِ مے کو یہ کیا دیکھتے ہیں آپ؟ اِس میں جواب ہے اُسی برقِ نگاہ کا

ہے ایک ہی جلوہ، جو اِدھر بھی ہے اُدھر بھی آئینہ بھی حیران ہے، آئینہ نگر بھی

قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریقِ عشق میں آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

سُنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے

تُم باخبر ہو چاہنے والوں کے حال سے سب کی نظر کا راز تمھاری نظر میں ہے

رِند جو ظرف اُٹھا لیں، وہی ساغر بن جائے جس جگہ بیٹھ کے پی لیں، وہیں مے خانہ بنے

ادائے عشق کی تصویر کھنچ گئی پوری وفورِ جوش سے یوں حُسن بے قرار ہُوا

تو برقِ حُسن اور تجلّی سے یہ گُریز مَیں خاک اور ذوقِ تماشا لیے ہوئے

ہے دلِ ناکامِ عاشق میں تمھاری یاد بھی یہ بھی کیا گھر ہے کہ ہے برباد بھی آباد بھی

حسرتِ ناکام میری کام سے غافل نہیں اِک طریقِ جستجو یہ دردِ مہجوری بھی ہے

جس میں ہر روز نئے رنگ سے آتی تھی بہار ہوگیا وہ چمنستانِ تمنّا تاراج

وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں سو حُسن کروں پیدا، ایک ایک تمنّا سے

حسرت و آرزو سے ہیں اہلِ ہوس بھی آشنا اِک غمِ ناتمام ہے طُرّۂ امتیازِ عشق

نشۂ عشق میں ہر چیز اُڑی جاتی ہے کون ذرّہ ہے کہ سرشارِ محبت میں نہیں

اِتنا کہ اِذنِ شورشِ فریاد دیجیے مجھ کو سوال کی نہ ضرورت جواب کی

جستجو ہے زِندگی، ذوقِ طلب ہے زِندگی — زِندگی کا راز لیکن دوریِ منزل میں ہے
عرش تک تو لے گیا تھا ساتھ اپنے حُسن کو — پھر نہیں معلوم اب خود عشق کس منزل میں ہے؟

تم اُس کافر کا ذوقِ بندگی اب پُوچھتے کیا ہو؟ — جسے طاقِ حرم بھی ابروئے خم دار ہوجائے
چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا مَوجِ حوادث سے — اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہوجائے

تمام دفترِ حکمت اُلٹ گیا ہوں میں — مگر کھلا نہ ابھی تک، کہاں ہوں، کیا ہوں میں؟
ترا جمال ہے، تیرا خیال ہے، تو ہے — مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں؟

مرنا تو ہے اِبتدا کی اِک بات — جینا ہے کمال مُنتہی کا
یاس، اِک جنونِ ہُشیاری — اُمید، فریب زندگی کا

شورشِ عندلیب نے رُوحِ چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

شاید مِرے سوا کوئی اُس کو سمجھ سکے — وہ ربطِ خاص رنجشِ بے جا کہیں جسے

یہ بھی فریب سے ہیں، کچھ دردِ عاشقی کے — ہم مرکے کیا کریں گے، کیا کرلیا ہے جی کر؟

جینا بھی آگیا مجھے، مرنا بھی آگیا — پہچاننے لگا ہوں تُمھاری نظر کو میں

اِقبالؔ ۔ محمد اقبال

ولادت ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء
وفات ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء

گیسوئے تاب دار کو اَور بھی تاب دار کر!
ہوش و خرد شکار کر! قلب و نظر شکار کر!

تو ہے محیطِ بے کراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہم کنار کر! یا مجھے بے کنار کر!

میں ہوں صدف، تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف، تو تو مجھے گوہرِ آبدار کر!

نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اِس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر!

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا اِنتظار کر!

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر!

(۲)

ستاروں سے آگے جہاں اَور بھی ہیں
ابھی عشق کے اِمتحاں اَور بھی ہیں

تہی، زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اَور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر!
چمن اور بھی، آشیاں اَور بھی ہیں

اگر کھو گیا اِک نشیمن، تو کیا غم؟
مقاماتِ آہ و فغاں اَور بھی ہیں

تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آشیاں اور بھی ہیں

اِسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا!
کہ تیرے زمان و مکاں اَور بھی ہیں

گئے دِن، کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اَور بھی ہیں

(۳)

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے، محرمِ گوش ہو!
وہ سرود کیا؟ جو چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو، تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں
دمِ طوف کرمکِ شمع نے، یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی؟
مرے جرمِ خانہ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں
جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں؟

(۴)

فطرت کو خرد کے روبرو کر! تسخیرِ مقامِ رنگ و بو کر!
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر!
تاروں کی فضا ہے بیکرانہ تو بھی یہ مقامِ آرزو کر!
عریاں ہیں ترے چمن کی حوریں چاکِ گل و لالہ کو رفو کر!
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت جو اس سے نہ ہو سکا، وہ تو کر!

(۵)

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن
برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے ہوں اگر شہروں سے بن پیارے، تو شہر اچھے، کہ بن؟
اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن!

من کی دُنیا ؛ من کی دُنیا ؛ سوز و مستی ، جذب و شوق
تن کی دُنیا ؛ تن کی دُنیا ؛ سود و سودا ، مکر و فن

مَن کی دُنیا ہاتھ آتی ہے ، تو پھر جاتی نہیں
تن کی دَولت چھاؤں ہے ، آتا ہے دھن ، جاتا ہے دھن

مَن کی دُنیا میں نہ پایا مَیں نے افرنگی کا راج
من کی دُنیا میں نہ دیکھے مَیں نے شیخ و برہمن

پانی پانی کر گئی مُجھ کو ، قلندر کی یہ بات
تو جُھکا جب غیر کے آگے ، نہ مَن تیرا ، نہ تن

(۶)

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج ، نظر کے سوا کچھ اور نہیں

ہر اِک مقام سے آگے ، مقام ہے تیرا
حیات ، ذوقِ سفر کے سوا ، کچھ اور نہیں

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ، ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا ، کچھ اور نہیں

رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر ، تو کیا حاصل؟
حیات ، سوزِ جگر کے سوا ، کچھ اور نہیں

عروسِ لالہ ! مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ مَیں نسیمِ سحر کے سوا ، کچھ اور نہیں

جسے کساد سمجھتے ہیں ، تاجرانِ فرنگ
وہ شَے ، متاعِ ہنر کے سوا ، کچھ اور نہیں

بڑا کریم ہے اقبالِ بے نوا ، لیکن
عطائے شعلہ ، شرر کے سوا ، کچھ اور نہیں

(۷)

اثر کرے ، نہ کرے ، سُن تو لے مری فریاد؛
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

یہ مُشتِ خاک ، یہ صرصر ، یہ وُسعتِ افلاک
کرم ہے یا کہ ستم ؛ تیری لذّتِ ایجاد

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گُل
یہی ہے فصلِ بہاری ؛ یہی ہے بادِ مُراد ؟

قصُوروار ، غریبُ الدّیار ہوں ، لیکن
ترا خرابہ ، فرشتے نہ کر سکے آباد

مری جفا طلبی کو دُعائیں دیتا ہے
یہ دشتِ سادہ ، یہ تیرا جہانِ بے بنیاد

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گُلستاں ، کہ جہاں گھات میں نہیں صیّاد

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس میں نہیں
اُنھیں کا کام ہے یہ ، جن کے حوصلے ہیں زیاد

(۸)

نہ تو زمیں کے لیے ہے ، نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے ، تو نہیں جہاں کے لیے

یہ عقل و دل ہیں شرر شعلۂ محبت کے
وہ خار و خس کے لیے ہے، یہ نیستاں کے لیے

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لیے ہے، نہ آشیاں کے لیے

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک؟
ترا سفینہ، کہ ہے بحرِ بے کراں کے لیے

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس رہے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

ذرا سی بات تھی، اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے، فقط زیبِ داستاں کے لیے

مرے گلو میں ہے اک نغمہ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لیے

(۹)

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

نہ بادہ ہے، نہ صراحی، نہ دورِ پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں، محرمِ رازِ درونِ میخانہ

کلی کو دیکھ، کہ ہے تشنۂ نسیمِ سحر
اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ

کوئی بتائے مجھے، یہ غیاب ہے کہ حضور؟
سب آشنا ہیں یہاں، ایک میں ہوں بیگانہ

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

(۱۰)

کریں گے اہلِ نظر، تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

یہ مدرسہ، یہ جواں، یہ سرور و رعنائی
انھیں کے دم سے ہے میخانۂ فرنگ آباد

نہ فلسفی سے، نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد

فقیہِ شہر کی تحقیر! کیا مجال مری!
مگر یہ بات، کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز
خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد

کیے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے
کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

(۱۱)

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی / کھُلتے ہیں غلاموں پر، اسرارِ شہنشاہی

عطارؔ ہو، رومیؔ ہو، رازیؔ ہو، غزالیؔ ہو / کچھ ہاتھ نہیں آتا، بے آہِ سحر گاہی

نومید نہ ہو ان سے، اے رہبرِ فرزانہ! / کم کوش تو ہیں لیکن، بے ذوق نہیں راہی

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی / جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ / ہو جس کی فقیری میں بوئے اسدُاللّٰہی

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی / اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

(۱۲)

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی / مرے کام کچھ نہ آیا، یہ کمالِ نے نوازی

میں کہاں ہوں؟ تو کہاں ہے؟ یہ مکاں کہ لامکاں ہے؟ / یہ جہاں مرا جہاں ہے؟ کہ تری کرشمہ سازی؟

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں / کبھی سوز و سازِ رومیؔ، کبھی پیچ و تابِ رازیؔ

وہ فریب خوردہ شاہیں، کہ پلا ہو کرگسوں میں / اسے کیا خبر، کہ کیا ہے، رہ و رسمِ شاہبازی؟

نہ زباں کوئی غزل کی، نہ زباں سے باخبر میں / کوئی دلکشا صدا ہو، عجمی ہو یا کہ تازی

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا / یہ سپہ کی تیغ بازی، وہ نگہ کی تیغ بازی

کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے / کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

(۱۳)

مٹا دیا مرے ساقی نے امتیازِ من و تو / پلا کے مجھ کو مئے لا الٰہ الا ھو

نہ مے، نہ شعر، نہ ساقی، نہ شورِ چنگ و رباب / سکوتِ کوہ و لبِ جو و لالۂ خود رو

گدائے مے کدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ / پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ، توڑتا ہے سبو

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں / کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

میں نو نیاز ہوں، مجھ سے حجاب ہی اولیٰ / کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو

اگرچہ بحر کی موجوں میں ہے مقام اس کا / صفائے پاکیِ طینت سے ہے گہر کا وضو

جمیل تر ہیں گُل و لالہ، فیض سے اُس کے ‏ نگاہِ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادُو

(۱۴)

اگر کج رَو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے، یا میرا؟ ‏ مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو؟ جہاں تیرا ہے، یا میرا!
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی ‏ خطا کس کی ہے یارب! لامکاں تیرا ہے، یا میرا!
اُسے صبحِ ازل اِنکار کی جُرأت ہُوئی کیوں کر؟ ‏ مجھے معلوم کیا؟ وہ رازداں تیرا ہے، یا میرا!
محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا ‏ مگر یہ حرفِ شیریں، ترجُماں تیرا ہے، یا میرا!
اِسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن ‏ زوالِ آدمِ خاکی، زیاں تیرا ہے، یا میرا!

(۱۵)

کھو نہ جا، اِس سحر و شام میں، اے صاحبِ ہوش! ‏ اِک جہاں اور بھی ہے، جس میں نہ فردا ہے، نہ دوش
کِس کو معلوم ہے، ہنگامۂ فردا کا مقام؟ ‏ مسجد و مکتب و مے خانہ ہیں مدّت سے خموش
مَیں نے پایا ہے اُسے اشکِ سحر گاہی میں ‏ جس دُرِ ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش
نئی تہذیب، تکلّف کے سوا کچھ بھی نہیں ‏ چہرہ روشن ہو، تو کیا حاجتِ گلگونہ فروش
صاحبِ ساز کو لازم ہے، کہ غافل نہ رہے ‏ گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

(۱۶)

میری نوائے شوق سے، شور حریمِ ذات میں ‏ غُلغلہ ہائے الاماں، بُت کدۂ صفات میں
حُور و فرشتہ ہیں اسیر، میرے تخیّلات میں ‏ میری نگاہ سے خلل، تیری تجلّیات میں
گرچہ ہے میری جستجو، دَیر و حرم کی نقش بند ‏ میری فغاں سے رستخیز، کعبہ و سومنات میں
گاہ مری نگاہِ تیز، چیر گئی دلِ وجُود ‏ گاہ اُلجھ کے رہ گئی، میرے توہّمات میں
تُو نے یہ کیا غضب کیا؟ مجھ کو بھی فاش کر دیا ‏ مَیں ہی تو ایک راز تھا، سینۂ کائنات میں

(۱۷)

ہزار خوف ہو، لیکن زباں ہو دِل کی رفیق ‏ یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
علاجِ ضُعفِ یقیں اُن سے ہو نہیں سکتا ‏ غریب، اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

مُرید سادہ تو رو رو کے ہو گیا تائب
خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق

وہی طلسمِ کہن میں اسیر ہے آدم
بغل میں اُس کی ہیں اب تک بُتانِ عہدِ عتیق

مرے لیے تو ہے اِقرار باللساں بھی بہت
ہزار شُکر، کہ مُلّا ہیں صاحبِ تصدیق

اگر ہو عشق، تو ہے کُفر بھی مُسلمانی
نہ ہو، تو مردِ مُسلماں بھی کافر و زِندیق

(۱۸)

خودی ہو علم سے محکم، تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم، تو صُورِ اِسرافیل

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اِس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

فریب خوردۂ منزل ہے کارواں، ورنہ
زیادہ راحتِ منزل سے ہے نشاطِ رحیل

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضُور کی لذّت، کہاں حجابِ دلیل

اندھیری شب ہے، جُدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لیے ہے مرا شُعلۂ نوا قندیل

غریب، سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حُسینؓ، اِبتدا ہے اِسماعیلؑ

فانیؔ

ولادت ۱۸۷۹ء
وفات ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء

وہ جی گیا، جو عشق میں جی سے گزر گیا
عیسیٰ کو ہو نوید، کہ بیمار مر گیا

آزاد کچھ ہوئے ہیں اسیرانِ زندگی
یعنی جمالِ یار کا صدقہ اتر گیا

دنیا میں حالِ آمد و رفتِ بشر نہ پوچھ
بے اختیار آکے رہا، بے خبر گیا

آیا کہ دل گیا، کوئی پوچھے تو کیا کہوں!
یہ جانتا ہوں، دل اِدھر آیا، اُدھر گیا

فانیؔ کی ذات سے غمِ ہستی کی تھی نمود
شیرازہ آج دفترِ غم کا بکھر گیا

(۲)

کسی کے ایک اشارے میں، کس کو کیا نہ ملا؟
بشر کو زیست ملی، موت کو بہانہ ملا

مذاقِ تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا
بغیرِ مرگ، جسے زیست کا مزا نہ ملا

دُعا گدائے اثر ہے، گدا پہ تکیہ نہ کر
کہ اعتقادِ اثر کیا؟ ملا، ملا، نہ ملا

مری حیات ہے محرومِ مدعائے حیات
وہ رہ گزر ہوں، جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا

وہ نامرادِ اجل، بزمِ یاس میں بھی نہیں
یہاں بھی فانیِؔ آوارہ کا پتا نہ ملا

(۳)

خوشی سے رنج کا بدلا، یہاں نہیں ملتا
وہ مل گئے، تو مجھے آسماں نہیں ملتا

مجاز اور، حقیقت کچھ اور ہے، یعنی
تری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا

بھڑک کے شعلۂ گل! تو ہی اب لگا دے آگ
کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

وہ بدگماں، کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں
مجھے یہ غم، کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا

تجھے خبر ہے؟ ترے تیرِ بے پناہ کی خیر
بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا

دیارِ عمر میں اب قحطِ مہر ہے فانیؔ!
کوئی اجل کے سوا، مہرباں نہیں ملتا

(۴)

اک معمہ ہے، سمجھنے کا نہ سمجھا
زندگی کاہے کو ہے؟ خواب ہے دیوانے کا۔

مختصر قصۂ غم یہ ہے، کہ دِل رکھتا ہوں — رازِ کونین خلاصہ ہے اِس افسانے کا
زندگی بھی تو پشیماں ہے، یہاں لاکے مجھے — ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مِرے مرجانے کا
تُم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہُوئے رنگ؟ — آؤ! دیکھو نا تماشا، مِرے غم خانے کا
اب اِسے دار پہ لے جاکے سُلادے ساقی! — یوں بہکنا نہیں اچھا، تِرے دیوانے کا
ہم نے چھانی ہیں بہت دَیر و حرم کی گلیاں — کہیں پایا نہ ٹھکانا تِرے دیوانے کا
چشمِ ساقی کے اثر سے نہیں ہے گُل رنگ — دِل مِرے خوں سے لبریز ہے پیمانے کا
ہر نفس عُمرِ گُزشتہ کی ہے مَیّت فانیؔ! — زِندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

(۵)

شوق سے ناکامی کی بدولت، کوچۂ دِل ہی چھوٹ گیا
ساری اُمیدیں ٹوٹ گئیں، دِل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا

فصلِ گُل آئی، یا اجل آئی، کیوں درِ زنداں کھلتا ہے؟
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا؟ یا کوئی قیدی چھوٹ گیا؟

لیجیے کیا دامن کی خبر؟ اور دستِ جنوں کو کیا کہیے؟
اپنے ہی ہاتھ سے دِل کا دامن، مُدّت گزری چھوٹ گیا؟

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے، کوئی تمنّا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اِک اِک ساتھی چھوٹ گیا

فانیؔ! ہم تو جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غُربت جس کو راس نہ آئی، اور وطن بھی چھوٹ گیا

(۶)

آ! ورنہ جانتا ہوں فریبِ نظر کو میں — دیکھوں اُلٹ کے پردۂ زخمِ جگر کو میں
ہر نقشِ پا کو دیکھ کے دُھنتا ہوں سر کو میں — پہچانتا نہیں ہوں تری رہ گزر کو میں
وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو — پُوچھوں نہ خضر سے بھی، کہ جاؤں کدھر کو میں؟

عہدِ خزاں میں رفتۂ آشوبِ ہوش ہوں — بھولا ہوا ہوں موسمِ دیوانہ گر کو میں
مایوسِ انتظار ہوں، مجنونِ اضطراب — ہنستا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں
بہلا نہ دل، نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی — یہ جانتا، تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں
دو چار ہچکیوں میں دمِ نزع کہہ گیا — شرحِ درازِ زندگیِ مختصر کو میں
فانیؔ! دعائے مرگ کی فرصت نہیں مجھے — یعنی ابھی تو ڈھونڈ رہا ہوں اثر کو میں

(۷)

دنیا میری بلا جانے، مہنگی ہے یا سستی ہے — موت ملے تو مفت نہ لوں، ہستی کی کیا ہستی ہے؟
آبادی بھی دیکھی ہے، ویرانے بھی دیکھے ہیں — جو اُجڑے اور پھر نہ بسے، دل وہ نرالی بستی ہے
جان سی شے بک جاتی ہے، ایک نظر کے بدلے میں — آگے مرضی گاہک کی، اِن داموں تو سستی ہے
جگ سونا ہے تیرے بغیر، آنکھوں کا کیا حال ہوا؟ — جب بھی دُنیا بستی تھی، اب بھی دُنیا بستی ہے
آنسو تھے سو خشک ہوئے، جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے — دِل پہ گھٹا سی چھائی ہے، کھُلتی ہے نہ برستی ہے
دِل کا اُجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم! — بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے
فانیؔ! جس میں آنسو کیا، دِل کے لہو کا کال نہ تھا — ہائے! وہ آنکھ، اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

(۸)

دِل میں اِک شمع سی جلتی نظر آتی ہے مجھے — آگے اِس شمع کو پروانہ بنایا ہوتا
تیرے سجدوں میں نہیں شانِ محبت زاہد! — سر کو خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا
دِل تری یاد سے آباد ہے اب تک، ورنہ — غم نے، کب کا؟ اِسے ویرانہ بنایا ہوتا
درد دے کر، دِلِ فانیؔ کو مٹا دینا تھا — اِس حقیقت کو بھی افسانہ بنایا ہوتا

(۹)

پھر وہ اندازِ نظر یاد آیا — خاکِ دِل، تا بہ جگر یاد آیا
ہر تبسم پہ یہ کھاتا ہوں فریب — کہ مجھے دیدۂ تر یاد آیا
آئنہ اب نہیں دیکھا جاتا — میں بہ عنوانِ دگر یاد آیا

درد کو پھر ہے مرے دل کی تلاش — خانہ برباد کو گھر یاد آیا
اُس کو بھولے تو ہوئے ہو فانیؔ! — کیا کروگے؟ وہ اگر یاد آیا

(۱۰)

کیوں نہ سب پہ ہو جاتا حالِ دل عیاں اپنا
ہر سکوتِ بے جا کی تہ میں تھا بیاں اپنا
دل سے کچھ اُمیدیں تھیں، وہ بھی اب اُنھیں کا ہے
کاش! عشق میں ہوتا، دل ہی رازداں اپنا
تیرے در سے اُٹھ کر ہم جائیں تو کدھر جائیں؟
اب زمین اپنی ہے، اور نہ آسماں اپنا
بجلیوں سے غربت میں کچھ بھرم تو باقی ہے
جل گیا مکاں، یعنی کوئی تھا مکاں اپنا
اُس نے دل کی حالت کا کیا اثر لیا ہوگا؟
دل نے کیا کہا ہوگا؟ دل ہے بے زباں اپنا
گھر ہے اب قفس فانیؔ! گھر کبھی چمن بھی تھا
ہاں کبھی وطن بھی تھا، اب وطن کہاں اپنا؟

(۱۱)

خود مسیحا، خود ہی قاتل ہیں، تو وہ بھی کیا کریں! — زخمِ دل پیدا کریں، یا زخمِ دل اچھا کریں
جسمِ آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی رُوح — خیر! جو چاہا کیا، اب یہ بتا ہم کیا کریں؟
خون کے چھینٹوں سے کچھ پھولوں کے خاکے ہی سہی — موسمِ گل آگیا؛ زنداں میں بیٹھے کیا کریں؟
شوقِ نظّارہ سلامت ہے، تو دیکھا جائے گا — اُن کو پروا ہی اگر منظور ہے، پردا کریں

ظرفِ ویرانہ، بہ قدرِ ہمّتِ وحشت نہیں
لاؤ! ہر ذرّے میں پیدا وسعتِ صحرا کریں

(١٢)

مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی، دیکھتے جاؤ!
بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی، دیکھتے جاؤ!

ابھی کیا ہے! کسی دن خوں رلائے گی یہ خاموشی
زبانِ حال کی جادو بیانی، دیکھتے جاؤ!

غرورِ حسن کا صدقہ، کوئی جاتا ہے دنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی، دیکھتے جاؤ!

بہارِ زندگی کا لطف دیکھا، اور دیکھو گے
کسی کا عیشِ مرگِ ناگہانی، دیکھتے جاؤ!

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ!

وہ اٹھا شورِ ماتم، آخری دیدارِ میت پر
اب اٹھا چاہتی ہے نعشِ فانی، دیکھتے جاؤ!

(١٣)

مانا، حجابِ دید، مری بے خودی ہوئی
تم وجہِ بے خودی نہیں، یہ ایک ہی ہوئی

دل ہے وہ طاق، غم کدۂ عمرِ دوش کا
رکھی ہے جس پہ شمعِ تمنا بجھی ہوئی

آتی رہے گی خیر! اب اس زندگی کو موت
یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی

مرحوم کس ادا کے تماشائیوں میں تھا
پھرتی ہے دل کی لاش تماشا بنی ہوئی

دنیائے دل میں یاس کی اللہ رے! دار و گیر
جو آرزو کہ خلق ہوئی، کشتنی ہوئی

کیجے دعا، کہ اف نہ کرے دردمندِ عشق
اول تو دل کو چوٹ، پھر اتنی دکھی ہوئی

میرا وجود، کفر، مری زندگی، گناہ
مستی کو ہوش، ہوش کو لازم خودی ہوئی

فانی! میں ہوں وہ نقطۂ موہومِ اتصال
جس میں عدم کی دونوں حدیں ہیں ملی ہوئی

(١٤)

موت کی رسم نہ تھی، ان کی ادا سے پہلے
زندگی درد بنائی تھی، دوا سے پہلے

کاٹ ہی دیں گے، قیامت کا دن اک اور سہی
دن گزارے ہیں محبت میں قضا سے پہلے

دو گھڑی کے لیے میزانِ عدالت ٹھہرے
کچھ مجھے حشر میں کہنا ہے خدا سے پہلے

کچھ ادائیں ہیں، جنھیں قتلِ عبث ہے منظور
کچھ سزائیں ہیں جو ملتی ہیں خطا سے پہلے

تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول اٹھے؟
وہ جو معصوم شرارت تھی، ادا سے پہلے

داورِ فانی میں یہ کیا ڈھونڈ رہا ہے، فانی! — زندگی بھی کہیں ملتی ہے، فنا سے پہلے

(۱۵)

اداسے، آڑ میں خنجر کی، منہ چھپائے ہوئے — مری قضا کو وہ لائے دلھن بنائے ہوئے

الٰہی! کیوں نہیں ہوتی کوئی بلا نازل؟ — اثر ہے دیر سے دستِ دعا اٹھائے ہوئے

تری لگائی ہوئی آگ حشر تک نہ بجھی — ہوئے نہ مر کے بھی ٹھنڈے، ترے جلائے ہوئے

بلائے جان، مگر پھر بھی آرزو ہے تری — ہم اُس کو اپنے کلیجے سے ہیں لگائے ہوئے

تمھیں کہو! تمھیں اپنا بنا کے کیا پایا؟ — مگر یہی، کہ جو اپنے تھے، سب پرائے ہوئے

اجل کو مژدۂ فرصت، کہ آج فانیِ زار — امیدِ وصل سے بیٹھا ہے لَو لگائے ہوئے

(۱۶)

نیرا، نگاہِ شوق! کوئی راز داں نہ تھا — آنکھوں کو ورنہ جلوۂ جاناں کہاں نہ تھا

اب تک تری گلی میں یہ رسوائیاں نہ تھیں — اب تک تو اِس زمیں پہ کوئی آسماں نہ تھا

مفہومِ کائنات تمھارے سوا نہیں — تم چھپ گئے نظر سے، تو سارا جہاں نہ تھا

آغوشِ موت میں تہِ دامانِ یار ہوں — وہ دِن گئے، کہ مجھ پہ کوئی مہرباں نہ تھا

آزردہ تھا، کہ ضبطِ فغاں میں اثر نہیں — شرمندہ ہوں کہ ضبطِ فغاں رائگاں نہ تھا

تو نے کرم کیا، تو بہ عنوانِ رنجِ زیست — غم بھی مجھے دیا، تو غمِ جاوداں نہ تھا

فانی! فسونِ موت کی تاثیر دیکھنا! — ٹھہرا وہ دِل، کہ جس پہ سکوں کا گماں نہ تھا

(۱۷)

کیوں نہ نیرنگِ جنوں پر کوئی قرباں ہو جائے؟ — گھر وہ صحرا، کہ بہار آئے تو زنداں ہو جائے

برق دم لینے کو ٹھہرے، تو رگِ جاں ہو جائے — فتنۂ حشر مجسم ہو، تو انساں ہو جائے

غم وہ راحت، جسے قسمت کے دھنی پاتے ہیں — دم وہ مشکل ہے کہ موت آئے تو آساں ہو جائے

خلد، مے خانے کو کہتے ہیں بہ قولِ واعظ — کعبہ بت خانے کو کہتے ہیں، جو ویراں ہو جائے

سجدہ کہتے ہیں درِ یار پہ مر جانے کو — قبلہ وہ سر ہے، جو خاکِ رہِ جاناں ہو جائے

(۱۸)

دشمنِ جاں تھے، تو جانِ مُدّعا کیوں ہو گئے؟ تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے؟
تو مرے دِل کی نہ سُن، یہ آئنہ ہے اِس سے پُوچھ تیری صُورت آشنا، درد آشنا کیوں ہو گئے؟
کیا تمھیں اندازۂ دردِ محبّت ہو گیا؟ چشمِ بد دُور، اب ستم حد سے سوا کیوں ہو گئے؟
دِل کی صورت، آکے پہلو سے تمھیں جانا نہ تھا اور گئے ہی تھے، تو جانِ بے وفا کیوں ہو گئے؟
لحد فانی: بڑھ گئی بیتابیِ دِل، بعدِ مرگ کیا کہیں؟ مر کر گرفتارِ بلا کیوں ہو گئے؟

(۱۹)

اِبتدائے عشق ہے، لُطفِ شباب آنے کو ہے صبر رُخصت ہو رہا ہے، اِضطراب آنے کو ہے
ہائے! کیسی کشمکش ہے؟ یاس بھی ہے، آس بھی دم نِکل جانے کو ہے، خط کا جواب آنے کو ہے
خانۂ تصویر میں آنے کو ہے تصویرِ یار آئنے میں قدِّ آدم آفتاب آنے کو ہے
گُدگُداتا ہے تصوّر، چُٹکیاں لیتا ہے درد کیا کسی بے خواب کی آنکھوں میں خواب آنے کو ہے؟
دیکھیے موت آئے فانی! یا کوئی فِتنہ اُٹھے میرے قابو میں دلِ بے صبر و تاب آنے کو ہے

(۲۰)

دُور لے جا ہٹا کے سرحدِ ناز دل ہے آوارۂ حدُودِ نیاز
ہاں، یہاں کوئی شے نہیں باطل عِشق ہے راز، عقل پردۂ راز
ہُوں، مگر کیا؟ یہ کچھ نہیں معلوم میری ہستی ہے غیب کی آواز
ہے کہ فانی! نہیں ہے، کیا کہیے؟ راز ہے بے نیازِ محرمِ راز

آیا ہے بعدِ مُدّت، بِچھڑے ہُوئے مِلے ہیں دِل سے لِپٹ لِپٹ کر غم بار بار رویا
نازک ہے آج شاید حالت مریضِ غم کی کیا چارہ گر نے سمجھا؟ کیوں بار بار رویا؟
فانی کو یا جُنوں ہے، یا تیری آرزو ہے
کل نام لے کے تیرا، دیوانہ وار رویا

بجلیاں ٹوٹ پڑیں، جب وہ مقابل سے اٹھا — مل کے پلٹی تھیں نگاہیں، کہ دھواں دل سے اٹھا
تو بھی مضرابِ جنوں! سازِ انا لیلیٰ چھیڑ! — ہائے وہ شورِ انا القیس کہ محمل سے اٹھا
موت، ہستی پہ وہ تہمت تھی، کہ آساں اٹھی — زندگی مجھ پہ وہ الزام کہ مشکل سے اٹھا
کس کی کشتی تہِ گردابِ فنا جا پہنچی — شورِ لبیک جو فانی! لبِ ساحل سے اٹھا

ان کو شباب کا، نہ مجھے دل کا ہوش تھا — اک جوش تھا، کہ محوِ تماشائے جوش تھا
برپا تھا دل کی لاش پہ اک مختصر سکوت — تیرے شہیدِ ناز کا ماتم خموش تھا
وحشت بہ قیدِ چاکِ گریباں روا نہیں — دیوانہ تھا، جو معتقدِ اہلِ ہوش تھا

کہتے ہیں حسن ہی کی امانت ہے دردِ عشق — اب کیا کسی کے عشق کا؟ دعویٰ کرے کوئی
وہ درد دے کہ موت بھی جس کی دوا نہ ہو — اس دل کو موت دے جسے اچھا کرے کوئی

ہاں، کوئی جادو جگاؤ آنکھ سے — ہاں، کوئی چلتا ہوا منتر چلے
خنجرِ قاتل کا شکوا کیا کریں؟ — جیتے جی ہم دل کے ہاتھوں مر چلے

ایک تم ہو، کہ تمھارے ہیں پرائے دل بھی — ایک میں ہوں، کہ مرا دل مرے قابو میں نہیں
دیکھتے ہیں تمھیں جاتے ہوئے، اور جیتے ہیں — تم بھی قابو میں نہیں، موت بھی قابو میں نہیں

آغاز بھی تو جس کا، انجام بھی تو جس کا — اس دردِ محبت کے افسانے کو کیا کہیے؟
آبادی کی آبادی، ویرانے کا ویرانہ — ارمان بھرے دل کے کاشانے کو کیا کہیے؟
کس نے اسے دیکھا ہے، اے حسرتِ نظارہ! — فانی تو ہے دیوانہ، دیوانے کو کیا کہیے؟

کہتے ہو کہ ہم وعدۂ فردا نہیں کرتے
یہ سن کے تو بیمار ہوا بھی نہیں جاتا

سن کے تیرا نام، آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

چشمِ ساقی کی وہ مخمور نگاہی، توبہ!
آنکھ پڑتی ہے پہ چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

جینے بھی نہیں دیتے، مرنے بھی نہیں دیتے
کیا تم نے محبت کی ہر رسم اٹھا ڈالی؟

اب مے میں نہ وہ کیف، نہ اب جام میں وہ بات
اے کاش! ترے ہاتھ سے ہم جام نہ لیتے

لطف، بیداد، حیا، غصہ، تغافل، شوخی
رنگ، کیا کیا نہ تلوّن نے ادا کے بدلے

کچھ اور حسین ہو گئے ہیں آپ
یہ بات نہ تھی ستم سے پہلے

خاکِ فانی کی قسم ہے تجھے، اے دشتِ جنوں!
کس سے سیکھا ترے ذرّوں نے بیاباں ہونا

جیے جانے کی تہمت کس لیے اٹھتی، کس طرح اٹھتی؟
ترے غم نے بچائی آبرو کی زندگی برسوں

طوفاں ہی ایک کیا؟ مجھے طوفاں سے کم نہیں
لنگر ہوا، سفینہ ہوا، ناخدا ہوا

اپنے کمالِ شوق پر، حشر کا دن ہے منحصر
وعدۂ دید چاہیے، زحمتِ انتظار کیا!

نگاہِ آخرِ فانی سے مختصر سن لو!
زبانِ خلق پہ ہوگی یہ داستاں طویل

کیا جانیے کہ حشر کیا ہو؟ صبحِ حشر کا
بیدار تیرے دیکھنے والے ہوئے تو ہیں

تعمیرِ آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق
جب ہم نے کوئی شاخ چنی، شاخ جل گئی

یا کہتے تھے، کچھ کہتے، جب اس نے کہا، کہیے!
تو چپ ہیں کہ کیا کہیے؟ کھلتی ہے زباں کوئی؟

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے، آ کے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے، جاگتے ہی سو جاتے ہیں

قطرہ قطرہ رہتا ہے، دریا سے جُدا رہ سکنے تک
جو تابِ جُدائی لا نہ سکے، وہ قطرہ فنا ہو جاتا ہے

زندگی جبر ہے، اور جبر کے آثار نہیں — ہائے! اِس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

گُناہ گار کی حالت ہے رحم کے قابل — غریب، کشمکشِ جبر و اختیار میں ہے

بیگانۂ اِختیار ہو جا — راضی بہ رضائے یار ہو جا

قُربان اِک ادائے تغافُل پہ لاکھ بار — وہ زِندگی، جو صرف ہوئی اِنتظار میں

کیوں سادگی میں طور اب کچھ بانکپن کے ہیں؟ — کل تک تو سادگی میں ادا بانکپن کی تھی

سرکار! پاسِ وضعِ جفا چاہتا ہوں میں — یہ بھی اگر جفا ہے، تو اچھا نہ کیجیے

فانیؔ! دوائے دردِ جگر زہر تو نہیں — کیوں ہاتھ کانپتا ہے مرے چارہ ساز کا؟

ہے ترا حُسنِ تغافُل جسے جو چاہے فریب — ورنہ تو، اور جفاؤں سے پشیماں ہوتا!

چمن سے رُخصتِ فانیؔ قریب ہے شاید — کہ آج بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے

مری اِک عمر فانیؔ! نزع کے عالم میں گُزری ہے
محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں

تجھے خبر ہے؟ ترے تیرِ بے پناہ کی خیر !
بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا

بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی
منہ پھیر لیا ہم نے، تو دنیا نہ رہے گی

کیوں اہلِ حشر! ہے کوئی نقادِ سوزِ دل !
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کیے ہوئے

اِک حشر اور چاہیے اِس روسیاہ کو
فانی زمینِ حشر میں غیرت سے گڑ گیا

حشر میں حشر چاہیے، حشر پہ حشر چاہیے
دفن ہیں سجدہ ہائے شوق ناصیۂ نیاز میں

یاں میرے قدم سے ہے ویرانے میں آبادی
واں گھر میں خدا رکھے، آباد ہے ویرانی

یُوں تو ساری عُمر ہی فانی ! گزار دی
اِک مرگِ ناگہاں کے غمِ انتظار نے

کسی کے غم کی کہانی ہے زندگی، فانی!
زمانہ ایک فسانہ ہے مرنے والوں کا

آج روزِ وصال ہے فانی !
موت سے ہو رہے ہیں ناز و نیاز

اور بندے ہیں جن کو دعویِ خدائی ہے
تھی ہماری قسمت میں بندگی خدا ہو کر

دنیا میں حالِ آمد و رفتِ بشر نہ پوچھ
بے اختیار آکے رہا، بے خبر گیا

وہ ہے مختار، سزا دے کہ جزا دے فانی!
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

بہار، نذرِ تغافل ہوئی، خزاں ٹھہری
خزاں شہیدِ تبسم ہوئی، بہار ہوئی

عہدِ جوانی ختم ہوا، اب جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
ہم بھی جیتے تھے جب تک مرجانے کا زمانہ تھا

حُسن ہے جاودانِ بے آغاز
عشق آغازِ جاوداں انجام

مژدہ جنتِ وصال ہے موت زندگیٔ محشرِ جدائی ہے

نہیں ضرور کہ مر جائیں جاں نثار ترے یہی ہے موت، کہ جینا حرام ہو جائے

اپنے دیوانے پہ اتمامِ کرم کر یارب! درودیوار دیے، اب انہیں ویرانی دے

یارب! نوائے دل سے تو کان آشنا ہیں آواز آرہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی

لذتِ فنا ہرگز گفتنی نہیں، یعنی دل ٹھہر گیا فانی! موت کی دعا کرکے

کس طرف جوشِ کرم! تیری نگاہیں اٹھیں کوئی محشر میں سزاوارِ عتاب آتا ہے

میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا؟ دولتِ دو جہاں نہ دی، اک دلِ مبتلا دیا

نہ بن پڑا کوئی عذرِ جفا کسی سے تو ہائے ادا وہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی

کہتے ہیں کیا ہی مزے کا ہے فسانہ فانی! آپ کی جان سے دور، آپ کے مر جانے کا

مرا قتل اُن کے ہاتھوں، یہ تو باتیں کچھ اُن کے منہ کی ہیں، کچھ نامہ بر کی

حُسنِ حیرت تو میسر ہے تماشا نہ سہی تیری محفل میں ہیں، گو نقش بہ دیوار ہیں ہم

بجلیاں شاخِ نشیمن پہ بچھی جاتی ہیں کیا نشیمن سے کوئی سوختہ ساماں نکلا؟

کم نہ تھی عمرِ اک نظر کے لیے عشق تھا مرگِ ناگہاں انجام

بارِ الم اٹھایا، رنگِ نشاط دیکھا آئے نہیں ہیں یوں ہی، اندازِ بے حسی کے

حسرت موہانی سید فضل الحسن
فیض؟

ولادت ۸۱-۱۸۸۰ء
وفات ۱۳ر مئی ۱۹۵۱ء

دل کو خیالِ یار نے مخمور کر دیا — ساغر کو رنگِ بادہ نے پُرنور کر دیا
مانوس ہو چلا تھا تسلّی سے حالِ دل — پھر تو نے یاد آ کے، بہ دستور کر دیا
بے تابیوں سے چھپ نہ سکا ماجرائے دل — آخر حضورِ یار بھی مذکور کر دیا
اہلِ نظر کو بھی نظر آیا نہ روئے یار — یاں تک حجابِ یار نے مستور کر دیا
حسرت! بہت ہے مرتبۂ عاشقی بلند — تجھ کو، تو مفت لوگوں نے مشہور کر دیا

(۲)

روشِ حسنِ مراعات چلی جاتی ہے — ہم سے اور اُن سے، وہی بات چلی جاتی ہے
اُس جفا جو سے، بہ ایمائے تمنّا اب تک — ہوسِ لطف و عنایات چلی جاتی ہے
ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں، لیکن — کوششِ پرسشِ حالات چلی جاتی ہے
اُس ستم گر کو ستم گر نہیں کہتے بنتا — سعیِ تاویلِ خیالات چلی جاتی ہے
رنجشِ یار سے پا لیتے ہیں دل کی باتیں — شہرتِ کشف و کرامات چلی جاتی ہے
غیرتِ حسن نے مجبور کیا ہے حسرت! — وصلِ جاناں کی یوں ہی رات چلی جاتی ہے

(۳)

بھلاتا لاکھ ہوں، لیکن برابر یاد آتے ہیں — الٰہی! ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں؟
نہ چھیڑ اے ہم نشیں! کیفیتِ صہبا کے افسانے — شرابِ بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں
رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں، اے وائے ناکامی! — وہ دشتِ خود فراموشی کے چکّر یاد آتے ہیں
نہیں آتی، تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی — مگر جب یاد آتے ہیں، تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرت! ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

(۴)

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے ؟ کہ اظہارِ تمنا کر دیا

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم تو سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

پڑھ کے تیرا خط، مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطرابِ شوق نے اک حشر برپا کر دیا

ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرمِ نیاز
تجھ کو آخر آشنائے نازِ بے جا کر دیا

اب نہیں دل کو کسی صورت، کسی پہلو قرار
اس نگاہِ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا جنوں کے مرتبے
مہر ذرّوں کو کیا، قطروں کو دریا کر دیا

تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھ کو، کیا مجال ؟
دیکھتا تھا میں، کہ تو نے بھی اشارا کر دیا

سب غلط کہتے ہیں لطفِ یار کو وجہِ سکوں
دردِ دل اس نے تو حسرتؔ ! اور دونا کر دیا

(۵)

نگاہِ ناز، جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے ؟

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ترے ستم سے میں خوش ہوں، کہ غالباً یوں بھی
مجھے تو شاملِ اربابِ امتیاز کرے

غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ اُن کے دردِ محبت سے ساز باز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تیری خوشی ہے، جو سرفراز کرے

(۶)

دلِ آرزوئے شوق کا اظہار نہ کر دے
ڈرتا ہے، مگر یہ کہ وہ انکار نہ کر دے

ہشیار ! کہ اس پرسشِ پیہم کی نوازش
عشاقِ ستم کش کو ہوس کار نہ کر دے

ہم جور پرستوں پہ گماں ترکِ وفا کا
یہ وہم کہیں تجھ کو گنہ گار نہ کر دے

ہوتا ہے بُرا لذّتِ آزار کا چسکا
مرنا بھی کہیں مجھ کو یہ دشوار نہ کر دے

کچھ حد بھی ہے اس سوزشِ خاموش کی، حسرت!
یہ کشمکشِ غم، تجھے بے کار نہ کردے

(۷)

سب سے چھپتے ہیں چھپیں، مجھ سے تو پردا نہ کریں
سیرِ گلشن وہ کریں شوق سے، تنہا نہ کریں

اب تو آتا ہے یہی جی میں، کہ اے محوِ جفا!
کچھ بھی ہو جائے، مگر تیری تمنا نہ کریں

میں ہوں مجبور، تو مجبور کی پرسش ہے ضرور
وہ مسیحا ہیں، تو بیمار کو اچھا نہ کریں؟

دردِ دل اور نہ بڑھ جائے تسلی سے کہیں
آپ اس کام کا زنہار ارادا نہ کریں

شکوۂ جور، تقاضائے کرم، عرضِ وفا
تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو، تو کیا کیا نہ کریں؟

حال کھل جائے گا بے تابیِ دل کا حسرت!
بار بار آپ انھیں شوق سے دیکھا نہ کریں!

(۸)

یاد کر وہ دن، کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا
باوجودِ حسن، تو آگاہِ رعنائی نہ تھا

عشقِ روز افزوں پہ اپنے، کوئی حیرانی نہ تھی
جلوۂ رنگیں پہ تجھ کو نازِ یکتائی نہ تھا

دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی
جب کہ تیرا حسن، سرگرمِ خود آرائی نہ تھا

کیا ہوئے وہ دن؟ کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق
ربط تھا دونوں میں، گو ربطِ شناسائی نہ تھا

تونے حسرت! کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

(۹)

صحبتِ اہلِ عشق و شغلِ شراب
تھا یہی مقتضائے عہدِ شباب

غیر پر دیکھ کر کرم تیرا
ہوگئی جانِ آرزو بیتاب

عشق سے ہے کہاں روا؟ اے حسن!
اس قدر اہتمامِ شرم و حجاب

مذہبِ عشق ہے پرستشِ حسن
ہم نہیں جانتے عذاب و ثواب

لطفِ جاناں ہے جور کی تمہید
دیکھ حسرت! نہ کھا فریبِ سراب

(۱۰)

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم ؟ — گھبرا گئے ہیں بے دلیِ ہمرہاں سے ہم
کچھ ایسی دُور بھی تو نہیں منزلِ مُراد — لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم
اے یادِ یار! دیکھ کہ باوصفِ رنجِ ہجر — مسرور ہیں تری خلشِ ناتواں سے ہم
اے زُہدِ خشک! تیری ہدایت کے واسطے — سوغاتِ عشق لائے ہیں کوئے بُتاں سے ہم
بے تابیوں سے چھپ نہ سکا حالِ آرزو — آخر بچے نہ اُس نگہِ ناتواں سے ہم
بے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق — پھر آ گئے وہیں پہ، چلے تھے جہاں سے ہم
حسرتؔ! کبھی اور جا کے کریں کس کی بندگی ؟ — اچھا، جو سر اُٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

(۱۱)

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام — دہکا ہوا ہے آتشِ گُل سے چمن تمام
اللہ ری! جسمِ یار کی خوبی، کہ خود بخود — رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
حیرت غرورِ حُسن سے، شوخی سے اضطراب — دل نے بھی تیرے سیکھ لیے ہیں چلن تمام
دیکھو تو چشمِ یار کی جادو نگاہیاں — بے ہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام
شیرینیِ نسیم ہے، سوز و گدازِ میرؔ — حسرتؔ! ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

(۱۲)

خوبرویوں سے یاریاں نہ گئیں — دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں
عقلِ صبر آشنا سے کچھ نہ ہوا — شوق کی بے قراریاں نہ گئیں
شوق یاں سدِّ راہِ علم رہا — عقل کی ہرزہ کاریاں نہ گئیں
تھے جو ہم رنگِ ناز، اُن کے ستم — دل کی اُمید واریاں نہ گئیں
مر کے بھی خاکِ راہِ یار ہوئے — اپنی اُلفت شعاریاں نہ گئیں

طرزِ مومنؔ میں مرحبا حسرتؔ!
تیری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

(۱۳)

وصل کی بنتی ہیں اِن باتوں سے تدبیریں کہیں؟ — آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں؟
بے زبانی ترجمانِ شوقِ بے حد ہو، تو ہو — ورنہ، پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں؟
مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ حُسن کی — اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں؟
التفاتِ یار تھا اِک خوابِ آغازِ وفا — سچ ہُوا کرتی ہیں اِن خوابوں کی تعبیریں کہیں؟
تیری بے صبری ہے حسرتؔ! خام کاری کی دلیل — گریۂ عُشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں؟

(۱۴)

عشق میں جان سے گزر جائیں — اب یہی جی میں ہے، کہ مر جائیں
یہ ہمیں ہیں، کہ قصرِ یار سے روز — بے خطر آکے، بے خبر جائیں
جامہ زیبی نہ پوچھیے اُن کی — جو بگڑنے میں بھی سنور جائیں
شب وہی شب ہے، دن وہی دن ہیں — جو تری یاد میں گزر جائیں
شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ! — سُنتے ہی، دل میں جو اُتر جائیں

(۱۵)

شبِ فُرقت میں یاد اُس بے خبر کی بار بار آئی — بُھلانا ہم نے بھی چاہا، مگر بے اختیار آئی
تری محفل سے ہم آئے، مگر باحالِ زار آئے — تماشا کامیاب آیا، تمنّا بے قرار آئی
جو اُن کے حُسن سے بھی بڑھ گئی ہے بے قراری میں — تڑپ ایسی کہاں سے حُسن میں؟ پروردگار! آئی
یہ کیا اندھیر ہے؟ اے دشمنِ اہلِ وفا! تجھ سے — ہوس نے کامِ جاں پایا، محبّت شرمسار آئی
الٰہی! رنگ یہ کب تک رہے گا؟ ہجرِ جاناں کا — کہ روزِ بے دلی گزرا، تو شامِ انتظار آئی
بجا ہیں کوششیں ترکِ محبّت کی، مگر حسرتؔ! — جو پھر بھی دل نوازی پر وہ چشمِ سحر کار آئی

(۱۶)

متھرا، کہ نگر ہے عاشقی کا — دم بھرتی ہے آرزو اُسی کا
ہر ذرۂ سرزمینِ گوکل — دارا ہے جمالِ دلبری کا

برسانہ و نندگانو جا کر دیکھ آئے ہیں جلوہ ہم کسی کا
پیغامِ حیاتِ جاوداں تھا ہر نغمہ کرشن کی بانسری کا
وہ نورِ سیاہ تھا کہ حسرت! سرچشمہ فروغِ آگہی کا

(۱۷)

توڑ کر عہدِ کرم ، ناآشنا ہوجائیے! بندہ پرور! جائیے! اچھا، خفا ہوجائیے!
میرے عذرِ جرم پر مطلق نہ کیجے التفات بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہوجائیے!
ہاں، یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُرجفا ہوجائیے!
جی میں آتا ہے کہ اُس شوخِ تغافل کیش سے اب نہ ملیے پھر کبھی، اور بے وفا ہوجائیے!
دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجے نکال آرزوئے شوق سے ناآشنا ہوجائیے!
ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہوجائیے!
بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہوجائیے!
ہائے ری بے اختیاری! یہ تو سب کچھ ہو مگر اُس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہوجائیے؟
چاہتا ہے مجھ کو تو بھولے، نہ بھولوں میں تجھے تیرے اس طرزِ تغافل کے فدا ہوجائیے!
کشمکش ہائے الم سے اب یہ حسرت! دل میں ہے چھٹ کے ان جھگڑوں سے مہمانِ قضا ہوجائیے!

(۱۸)

نطق کی اُن سے التجا نہ کریں ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں
مل رہے گا، جو اُن سے ملنا ہے لب کو شرمندۂ دعا نہ کریں
صبر مشکل ہے، آرزو بیکار کیا کریں عاشقی میں؟ کیا نہ کریں
مرضیِ یار کے خلاف نہ ہو لوگ میرے لیے دعا نہ کریں
شوق اُن کا، سو مٹ چکا حسرت! کیا کریں ہم؟ اگر وفا نہ کریں

(۱۹)

وفا سے دشمنی رکھ کر، مرے دل کی طلبگاری بہت مشکل ہے اِس جنسِ گرامی کی خریداری

ہوئیں ناکامیاں، بدنامیاں، رسوائیاں کیا کیا؟ — نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواداری

نہیں غم جیب و داماں کا، مگر ہاں فکر ہے اتنی — نہ اُٹھے گا مرے دستِ جنوں سے رنجِ بیکاری

نہ اُن کو رحم آتا ہے، نہ مجھ سے صبر ممکن ہے — کہیں آسان ہو یارب! محبت کی یہ دشواری

وفورِ اشکِ پیہم سے، ہجومِ شوقِ بے حد سے — مری آنکھوں سے ہے اِک آبشارِ آرزو جاری

نہ دیکھے اور دلِ عشّاق پر پھر بھی نظر رکھے — قیامت ہے نگاہِ یار کا حسنِ خبرداری

رونقِ پیرہن ہوئی، خوبیِ جسمِ نازنیں — اور بھی شوخ ہو گیا، رنگ ترے لباس کا

رنگ سونے میں چمکتا ہے طرحداری کا — طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی — مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

عشّاق کے دل نازک، اُس شوخ کی خو نازک — نازک اسی نسبت سے ہے کارِ محبت بھی

دیکھ اے ستمِ جاناں! یہ نقشِ محبت ہیں — بنتے ہیں بہ دشواری، مٹتے ہیں بہ آسانی

یہ جو اِک دردِ محبت کی خلش ہے حسرت! — مقصدِ دل ہے یہی، جانِ تمنّا ہے یہی

حسرت! وہ سن رہے ہیں جو اہلِ وفا کا حال — اِس میں بھی کچھ فریب تری داستاں کے ہیں

شوق جب حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یہی — ورنہ ہم اور کرمِ یار کی پروا نہ کریں؟

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی — دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

ہے ہجر میں سامانِ وصال، زہے خوبیِ خیال — بیٹھے ہیں انجمن میں، تری انجمن سے دور

سادگی! ہائے تمنّا کے مزے جاتے رہے — ہو گئے مشتاق ہم، اور وہ خود آرا ہو گیا

سچ جو پُوچھیے، تو حُسن سے کچھ کم نہیں ہے عشق
یہ جانِ عاشقاں ہے، وہ جانانِ عاشقاں

تُو نے کی حسرت! عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اِس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

دیارِ شوق میں برپا ہے ماتم مرگِ حسرت کا
وہ وضعِ پارسا اُس کی، وہ عشقِ پاک بازوں کا

ہے مشقِ سخن جاری، چکّی کی مشقّت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

گرفتارِ مُصیبت ہوں، اسیرِ دامِ محنت ہوں
مَیں رُسوائے جہانِ آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں

نہ سمجھا سوا حُسن کے اور کوئی
بیانِ تمنّا، زبانِ محبت

عشقِ صادق نے، حُسنِ کامل سے
نہ سُنا ذکرِ برتری، نہ کیا

بڑھا تو خوب مگر نازِ عاشقی کا جلال
حریفِ جلوۂ نورِ جمال ہو نہ سکا

قوتِ عشق بھی کیا شے ہے کہ ہو کر مایوس
جب کبھی گرنے لگا ہوں میں، سنبھالا ہے مجھے

ہم رضا شیوہ ہیں، تاویلِ ستم خود کرلیں
کیا ہوا؟ اُن سے اگر بات بنائی نہ گئی

دل اور تہیّۂ ترکِ خیالِ یار کرے
کسے یقین ہو؟ کون اِس پہ اعتبار کرے؟

حضورِ یار گئے بھی تو کیا ہوا؟ حسرت!
سلام کر نہ سکے ہم، سوال ہو نہ سکا

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر
ہم سے اظہارِ مدّعا نہ ہُوا

کیوں کر سُنائے کوئی انھیں شوق کی وہ بات
جو پڑ گئی ہو کشمکشِ التماس میں

تمنّا نے کی خوب نظارہ بازی
مزہ دے گئی حُسن کی بے شعوری

پھر تری یاد ہوئی موجبِ آرائشِ دل
بلّٰہِ الحمد، پھر آباد یہ ویرانہ ہُوا

رُوح کو محوِ جمالِ رُخِ جاناں کر لیں
ہم اگر چاہیں، تو زِنداں کو گُلِستاں کر لیں

مرحبا حسرتؔ! بنائی خوب تصویرِ سُخن
رنگِ مومنؔ، خوش نُما کس درجہ اِس پیکر میں ہے

کہاں سے آئیں گی رنگینیاں ترکیبِ مومنؔ کی؟
یہ لُطفِ خوش بیانی حسرتِ رنگیں بیاں تک ہے

مرحبا حسرت! زہے خوب اندازِ نسیمؔ
لُطف ہر ہر شعر میں ہیں بندشِ اُستاد کے

حسرتؔ: تری شگُفتہ کلامی پہ آفریں
یاد آگئیں نسیمؔ کی رنگیں بیانیاں

نسیمِ دہلوی کو وجد ہے فردوس میں حسرتؔ!
جزاک اللہ! تیری شاعری ہے یا فسوں کاری؟

شعر سے تیرے ہوئی مُصحفی و میرؔ کے بعد
تازہ، حسرتؔ! اثر و حُسنِ بیاں کی صورت

غالبؔ و مُصحفیؔ و میرؔ و نسیمؔ و مومنؔ
طبعِ حسرتؔ نے اُٹھایا ہے ہر اُستاد سے فیض

قائم ہے ترے دم سے طرزِ سُخنِ قائمؔ
پھر ورنہ، کہاں؟ حسرتؔ! یہ رنگِ غزل خوانی

ہے زبانِ لکھنؤ میں طرزِ دہلی کی نمُود
تجھ سے حسرتؔ! نام رَوشن شاعری کا ہو گیا

یاسؔ، یگانہ - مرزا واجد حسین

ولادت ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ / ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء
وفات ۴ فروری ۱۹۵۶ء

ہنوز زندگیِ تلخ کا مزا نہ ملا — کمالِ صبر ملا، صبر آزما نہ ملا
ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس — عدم کی راہ میں، کوئی پیادہ پا نہ ملا
اُمید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر — کہاں کے دَیر و حرم؟ گھر کا راستا نہ ملا
بہ جُز ارادہ پرستی، خُدا کو کیا جانے؟ — وہ بدنصیب، جسے بختِ نارسا نہ ملا
نگاہِ یاس سے ثابت ہے سعیِ لاحاصل — خُدا کا ذکر تو کیا؟ بندۂ خدا نہ ملا

(۲)

قفس کو جانتے ہیں یاسؔ، آشیاں اپنا — مکاں اپنا، زمیں اپنی، آسماں اپنا
بس ایک سایۂ دیوارِ یار کیا کم ہے؟ — اُٹھا لے سر سے مرے، سایۂ آسماں اپنا
سُنا ہے رنگِ زمانہ کا اعتبار نہیں — بدل نہ جائے یقیں سے کہیں گُماں اپنا
جرس نے مژدۂ منزل سُنا کے چونکایا — نکل چلا تھا دبے پاؤں کارواں اپنا
خُدا کسی کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے — قفس کے سامنے جلتا ہے آشیاں اپنا

(۳)

ادب نے دل کے تقاضے اُٹھائے ہیں کیا کیا؟ — ہوس نے شوق کے پہلو دبائے ہیں کیا کیا؟
اسی فریب نے مارا، کہ کل ہے کتنی دور؟ — اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا؟
کسی کے روپ میں تم بھی تو اپنے درشن دو — جہاں میں شاہ و گدا رنگ لائے ہیں کیا کیا؟
پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے — اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا؟
بلند ہو، تو کُھلے تجھ پہ راز پستی کا — بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا؟
خوشی میں اپنے قدم چوم لوں، تو زیبا ہے — وہ لغزشوں پہ مری مُسکرائے ہیں کیا کیا؟

خُدا ہی جانے یگانہ! میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟
خُود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا؟

(۴)

نہ انتقام کی عادت، نہ دل دُکھانے کی — بدی بھی کر نہیں آئی مجھے، بھلا نیکی؟
ہوا کے ساتھ پھرے چار سمت آوارہ — قدم اُٹھائے جو رفتار پر زمانے کی
ہر ایک ذرّے سے آتی ہے بُوئے زندہ دلی — نہ جانے خاک ہے اپنی کس آستانے کی
اب اپنے ختمِ سفر میں کچھ ایسی دیر نہیں — جو دیر ہے تو فقط تھک کے بیٹھ جانے کی
ہوس ہے سلسلہ جُنبانِ سعیِ لاحاصل — بھری ہے سر میں ہوا قسمت آزمانے کی

(۵)

کہاں تلک دلِ غم ناک پردہ دار رہے؟ — زبانِ حال پہ جب کچھ نہ اختیار رہے
نظامِ دہر نے کیا کیا نہ کروٹیں بدلیں — مگر ہم ایک ہی پہلو سے بے قرار رہے
زمانہ اس کے سوا اور کیا وفا کرتا؟ — چمن اُجڑ گیا، کانٹے گلے کا ہار رہے
خزاں کے دم سے مٹا خوب و زشت کا جھگڑا — چلو یہ خوب ہُوا، گُل رہے نہ خار رہے
یگانہ! حال تو دیکھو زمانہ سازوں کا — ہوا میں بیٹھے بگولے خراب و خوار رہے

(۶)

دُھواں سا جب نظر آیا، سوادِ منزل کا — نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا
کبھی تو موج میں آئے گا تیرا دیوانہ — اشارہ چاہیے ہے، جُنبشِ سلاسل کا
خود اپنی آگ میں جلتا، تو کیمیا ہوتا — مزاج داں نہ تھا پروانہ شمعِ محفل کا
ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر — ہُوا ہنوز نہ گرداب کا، نہ ساحل کا
حضورِ دوست یگانہ کچھ ایسے غائب تھے — زبانِ گُنگ تک آیا نہ ماجرا دل کا

(۷)

کارگاہِ دُنیا کی نیستی بھی ہستی ہے — اِک طرف اُجڑتی ہے، ایک سمت بستی ہے
بے دلوں کی ہستی کیا؟ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں — خواب ہے نہ بیداری، ہوش ہے نہ مستی ہے
کیمیائے دل کیا ہے؟ خاک ہے، مگر کیسی؟ — لیجیے تو مہنگی ہے، بیچیے تو سستی ہے

چتونوں سے مِلتا ہے، کچھ سُراغ باطن کا — چال پر تو ظالم کی سادگی برستی ہے
دیدنی ہے یاسؔ! اپنے رنج و غم کی طُغیانی — جھوم جھوم کر کیا کیا؟ یہ گھٹا برستی ہے

(۸)

بند ہی ہے کشمکش، آپس میں گفتگو نہ سہی — زبانِ حال سہی، حرفِ آرزو نہ سہی
بھری بہار میں نیّت نہ ہو گی ڈانوا ڈول — خیالِ خام سہی، تیری آرزو نہ سہی
مزاج کیوں نہ بہکتا زمانہ سازوں کا؟ — زمانہ اُن کے مُوافق ہے، ایک تو نہ سہی
پیامِ حق تو اِدھر ہی سے آئے گا اِک دِن — کھڑے ہیں مُنتظرِ وقت، جُستجو نہ سہی
خُدا کے سامنے پاکیزگی جتانا کیا؟ — نِگاہ پاک ہو، دِل صاف ہو، وضو نہ سہی

(۹)

خلش تو کوئی دلِ دوست میں نہ رہ جائے — بجا ہے، شوق سے، جو مُنھ میں آئے، کہہ جائے
یہ کیا؟ کہ ہر کس و ناکس سے دِل لگا بیٹھے — وہیں کا ہو رہے اِنسان، جس جگہ جائے
ارے! گئی تو گئی، جس کی بات اُس کے ساتھ — یہ کیا سِتم؟ کہ جوانی کی یاد رہ جائے
وطن کو چھوڑ کے پہنچا غریب جنّت میں — یہاں سے اَور کہاں جائے؟ کس جگہ جائے؟
کہاں کا جُرم، کہاں کی سزا؟ کہاں کا عذاب؟ — جہاں اِشارۂ پنہاں، کچھ اَور کہہ جائے
دِلِ سِتم زدہ آغوشِ کامرانی میں — خُدا نہ خواستہ، آسُودہ ہو کے رہ جائے

(۱۰)

حُسن سے بے خبر گزرنا کیا؟ — سِجدۂ حق ادا نہ کرنا کیا؟
دم بخود ہیں تمام محرمِ راز — تہ کو پہنچے، تو پھر اُبھرنا کیا؟
دیکھ ڈالے بہت جلال و جمال — برق چمکے تو چمکے، ڈرنا کیا؟
اِک نِگاہِ غلط اِدھر بھی سہی — یار! انصاف سے گزرنا کیا؟

لااُبالی جیے، خوشی سے مرے
رات دِن غم کے مارے مرنا کیا؟

(۱۱)

خدا کہاں ہے؟ کہ کسے درمیان دے کوئی؛ بُتوں کے نام پر شاید امان دے کوئی
کدھر سے آتی ہے مستانہ بوئے پیراہن؟ کہاں ہے؟ کون ہے؟ کس کا نشان دے کوئی
نگاہِ حُسن کا حُسنِ طلب ہے جانِ اُمید اُمید ایسی، تو پھر کیوں نہ جان دے کوئی؟
مزا ستانے کا جب ہے کہ دل ٹھکانے ہو حواس گُم ہوں، تو کیا امتحان دے کوئی؟

(۱۲)

خُودی کا نشہ چڑھا، آپ میں رہا نہ گیا خُدا بنے تھے یگانہ، مگر بنا نہ گیا
گُناہِ زندہ دلی کہیے، یا دِل آزاری کسی پہ ہنس لیے اتنا، کہ پھر ہنسا نہ گیا
پُکارتا رہا کس کس کو، ڈوبنے والا خُدا تھے اتنے، مگر کوئی آڑے آ نہ گیا
سمجھتے کیا تھے؟ مگر سُنتے تھے ترانۂ درد سمجھ میں آنے لگا جب، تو پھر سُنا نہ گیا
کرشن کا ہوں پُجاری، علی کا بندہ ہوں یگانہ! شانِ خُدا دیکھ کر رہا نہ گیا

(۱۳)

مُجھے دِل کی خطا پر یاس! شرمانا نہیں آتا پرایا جُرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا
مُجھے اے ناخُدا! آخر کسی کو مُنھ دِکھانا ہے بہانا کرکے، تنہا پار اُتر جانا نہیں آتا
مُصیبت کا پہاڑ آخر کسی دِن کٹ ہی جائے گا مُجھے سر مار کر تیشے سے، مر جانا نہیں آتا
دِلِ بے حوصلہ ہے اِک ذرا سی ٹھیس کا مہماں وہ آنسو کیا پیے گا؟ جس کو غم کھانا نہیں آتا
سراپا راز ہوں میں، کیا بتاؤں؟ کون ہوں؟ کیا ہوں؟ سمجھتا ہوں، مگر دُنیا کو سمجھانا نہیں آتا

(۱۴)

چلے چلو! جہاں لے جائے ولولہ دِل کا دلیلِ راہِ محبت ہے فیصلہ دِل کا
ہوائے کوچۂ قاتِل سے بس نہیں چلتا کشاں کشاں لیے جاتا ہے قافلہ دِل کا
گِلہ کسے ہے؟ کہ قاتِل نے نیم جاں چھوڑا تڑپ تڑپ کے نکالوں گا حوصلہ دِل کا
خُدا بچائے، کہ نازک ہے اُن میں ایک سے ایک تُنک مزاجوں سے ٹھہرا ہے مُعاملہ دِل کا

پیالہ خالی اُٹھا کر لگا لیا مُنھ سے — کہ یاسؔ! کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

(۱۵)

چراغِ زیست بُجھا، دل سے اِک دُھواں نکلا — لگا کے آگ، مِرے گھر سے میہماں نکلا
تڑپ کے آبلہ پا، اُٹھ کھڑے ہُوئے آخر — تلاشِ یار میں جب کوئی کارواں نکلا
لہُو لگا کے شہیدوں میں ہو گئے داخل — ہوس تو نکلی، مگر حوصلہ کہاں نکلا؟
زمانہ پھر گیا، چلنے لگی ہوا اُلٹی — چمن کو آگ لگا کر جو باغباں نِکلا
کلامِ یاسؔ سے دُنیا میں پھر اِک آگ لگی — یہ کون؟ حضرتِ آتشؔ کا ہم زباں نِکلا

(۱۶)

لذّتِ زندگی مُبارک باد! — کل کی کیا فِکر؟ ہرچہ بادا باد
اے خوشا زندگی! کہ پہلوئے شوق — دوست کے دم قدم سے ہے آباد
مُڑ کے دیکھا نہ آشیاں کی طرف — خُون ہو ہو کے دِل میں رہ گئی یاد
زیست کے ہیں یہی مزے، واللہ! — چار دِن شاد، چار دِن ناشاد
کون دیتا ہے دادِ ناکامی؟ — خُونِ فرہاد، برسرِ فرہاد
صبر اِتنا نہ کر، کہ دشمن پر — تلخ ہو جائے، لذّتِ بیداد
صُلح کر لو یگانہؔ! غالبؔ سے — وہ بھی اُستاد، تُم بھی اِک اُستاد

(۱۷)

چُپ لگی مُجھ کو، گُناہِ عشق ثابت ہو گیا — رنگ چہرے کا اُڑا، رازِ دلِ مُضطر کُھلا
اشکِ خُوں سے، زرد چہرے پر ہے کیا طُرفہ بہار؛ — دیکھیے! رنگِ جنُوں، کیسا مِرے مُنھ پر کُھلا!
بند آنکھیں ہو گئیں، بیتاب ہو ہو کر گرے — سامنے پیاسوں کے کس نے رکھ دیا ساغر کُھلا؟
رنگ بدلا پھر ہوا کا، مے کشوں کے دِن پھرے — پھر چلی بادِ صبا، پھر مے کدے کا در کُھلا
ہاتھ اُلجھا ہے گریباں میں، تو گھبراؤ نہ یاسؔ!
بیڑیاں کیوں کر کٹیں؟ زِنداں کا در کیوں کر کُھلا؟

(۱۸)

جو سبزِ باغِ تمنّا پہ پھیر دے پانی
خُدا بچائے، ہم ایسی نظر سے در گزُرے

نکالے عَیب میں سَو حُسن، حُسن میں سَو عَیب
خیال ہی تو ہے، جیسا بندھے، جدھر گزُرے

زمین پانْو تلے سے نکل گئی تو کیا؟
ہم اپنی دُھن میں زمانے سے بے خبر گزُرے

خُدا کرے جو بھروسا ہے حضرتِ دِل کا
خدا نہ خواستہ، شک ایسے دوست پر گزُرے

ادب کے واسطے کتنوں کے دِل دُکھائے ہیں
یگانہؔ! حد سے گزُرنا نہ تھا، مگر گزُرے

(۱۹)

کیوں؟ کسی سے وفا کرے کوئی
دِل نہ مانے، تو کیا کرے کوئی؟

مَوت بھی آ سکی نہ مُنھ مانگی
اَور کیا اِلتجا کرے کوئی؟

ہنس بھی لیتا ہوں اُوپری دِل سے
جی نہ بہلے، تو کیا کرے کوئی؟

اپنے دم کی ہے رَوشنی ساری
دیدۂ دِل تو وا کرے کوئی

شمع کیا؟ شمع کا اُجالا کیا؟
دِن چڑھے سامنا کرے کوئی

(۲۰)

کیوں اجل! ہے کوئی ایسا؟ کہ مرا مُنھ سی دے
بات اپنی نہیں بننے کی، تو اچھا نہ بنے

دِل وہی دِل ہے، جو ہو اپنی حرارت سے فنا
خاک ہو جائے، مگر آگ بگولہ نہ بنے

ڈوب کر دیکھیے، تو اِنسان کہیں کا نہ رہے
عَین حکمت ہے، اگر آپ سے بیگانہ بنے

دِلِ آگاہ پہ جادو نہ چلے گا کوئی
ہاں، مگر مصلحتِ وقت سے بیگانہ بنے

نگہِ یاس، ارے توبہ! جدھر اُٹھ جائے
دِل تو کیا؟ عالمِ ایجاد بھی ویرانہ بنے

(۲۱)

آنکھیں ہوں جس کی، آنکھوں ہی آنکھوں میں تاڑ لے
درد اپنا وہ نہیں، کہ ٹٹولا کرے کوئی

دِل مضطرِب، نگاہ گرفتارِ شش جہات
فرمائیے! کدھر کا اِرادا کرے کوئی؟

یا بس بخیر، یادِ خُدا آ ہی جاتی ہے
اپنی طرف سے لاکھ بُھلایا کرے کوئی

طاعت ہو یا گناہ، پسِ پردہ خوب ہے — دونوں کا جب مزہ ہے، کہ تنہا کرے کوئی
بندے نہ ہوں گے، جتنے خدا ہیں خدائی میں — کس کس خدا کے سامنے سجدہ کرے کوئی

دل لگانے کی جگہ عالمِ ایجاد نہیں — خواب آنکھوں نے بہت دیکھے، مگر یاد نہیں
دشمن و دوست سے آباد ہیں دونوں پہلو — دل سلامت ہے تو گھر عشق کا برباد نہیں
فکرِ امروز، نہ اندیشۂ فردا کی خلش — زندگی اس کی، جسے موت کا دن یاد نہیں

موت کی یاد میں، نیند اور بھی اڑ جاتی ہے — نیند آ جائے، تو کچھ موت کا ساماں ہو جائے
پاؤں پھیلاتے ہیں رہ رہ کے اسیرانِ ہوس — چاہتے ہیں. قفسِ تنگ گلستاں ہو جائے
یاس! بیداریِ موہوم ہے ساری ہستی — آنکھ ہو بند، تو سب خواب پریشاں ہو جائے

ہوش اڑ نہ جائیں، صنعتِ بہزاد دیکھ کر — آئینہ رکھ کے سامنے. تصویر دیکھنا!
ہر خواب وزِ شب آپ ہی اپنی مثال ہے — حدِ کمالِ کاتبِ تقدیر دیکھنا!
اصلاح کی مجال نہیں ہے، تو کیا ضرور؟ — بے ربطیِ نوشتۂ تقدیر دیکھنا!

کس محبت سے دلِ گم گشتہ دیتا ہے صدا
آ ادھر! پھرتا ہے آوارہ کدھر؟ میرے لیے
لے چلا ہوں وعدۂ فردا گرہ میں باندھ کر
چاہیے ہے اور کیا زادِ سفر میرے لیے؟

نہ گیا، خوابِ فراموش کا سودا نہ گیا — جاگتے سوتے انھیں یاد کیے جاتے ہیں
نشۂ حسن کی یہ لہر، الٰہی! توبہ — تشنہ کام آنکھوں ہی آنکھوں میں پیے جاتے ہیں

کہتے ہو اپنے فعل کا مختار ہے بشر
اپنی تو موت تک بھی نہیں اختیار میں
دنیا سے یاس! جانے کو جی چاہتا نہیں
واللہ! کیا کشش ہے اس اُجڑے دیار میں؟

بھلا اب کیا جچوں اپنی نظر میں
نظر اپنی، پرائی ہو چکی، بس!
رہا کیا؛ جب دلوں میں فرق آیا
اُسی دن سے جدائی ہو چکی، بس!

بشر ہوں میں، فرشتہ کیوں بنوں؟ جیسا ہوں اچھا ہوں
بغاوت اپنی فطرت سے، نصیبِ دشمناں، کیوں ہو؟

جھیل لیں گے ہجر کے مارے قیامت کا بھی دن
آج کی شب تو کٹے، پھر کوئی دشواری نہیں

افسردہ خاطروں کی خزاں کیا؛ بہار کیا؟
کُنجِ قفس میں مر رہے یا آشیانے میں

کبھی نہ پرورشِ نخلِ آرزو کرتے
نمو سے پہلے، جو اندیشۂ نمو کرتے

بوئے وفا کہاں؛ چمنِ روزگار میں
دل ہٹ گیا ہے، جیسے کوئی پھول جھڑ گیا

اِک معنیِ بے لفظ ہے اندیشۂ فردا
جیسے خطِ قسمت کو پڑھا بھی نہیں جاتا

ثبوتِ زندگیِ عشق کچھ تو دیتا تھا
نشانِ دل نہ سہی، دردِ بے نشاں ہوتا

فراق ۔ رگھوپتی سہائے

ولادت ۲۸ اگست ۱۸۹۶ء
وفات ؍ فروری ۱۹۸۲ء

نگاہِ ناز نے پردے اُٹھائے ہیں کیا کیا ؟
حجاب اہلِ محبت کو آئے ہیں کیا کیا ؟
جہاں میں تھی بس اِک افواہ تیرے جلووں کی
چراغِ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا ؟
نثارِ نرگسِ مے گوں، کہ آج پیمانے
لبوں تک آتے ہوئے تھرتھرائے ہیں کیا کیا ؟
کہیں چراغ، کہیں گُل. کہیں دلِ برباد
خرامِ ناز نے فتنے اُٹھائے ہیں کیا کیا ؟
دوچار برقِ تجلی سے رہنے والوں نے
فریب، نرم نِگاہی کے کھائے ہیں کیا کیا ؟
بہ قدرِ ذوقِ نظر، دیدِ حُسن کیا ہو ؟ مگر
نِگاہِ شوق میں جلوے سمائے ہیں کیا کیا ؟
پیامِ حُسن، پیامِ جُنوں، پیامِ وفا
تری نِگہ نے فسانے سُنائے ہیں کیا کیا ؟
نظر بچا کے ترے عشوہ ہائے پنہاں نے
دِلوں میں دردِ محبت اُٹھائے ہیں کیا کیا ؟
وہ اِک ذرا سی جھلک برقِ کم نِگاہی کی
جِگر کے زخمِ نِہاں مُسکرائے ہیں کیا کیا !
فراق ! راہِ وفا میں سُبک روی تیری
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا !

۲

یہ نکہتوں کی نرم روی، یہ ہوا، یہ رات
یاد آ رہے ہیں عشق کے ٹوٹے تعلُّقات
مایوسیوں کی گود میں دم توڑتا ہے عشق
اب بھی کوئی بنا لے، تو بگڑی نہیں ہے بات
اِک عُمر کٹ گئی ہے ترے اِنتظار میں
اَیسے بھی ہیں، کہ کٹ نہ سکی جن سے ایک رات
جن کا سُراغ پا نہ سکی غم کی رُوح بھی
ناداں ! ہُوئے ہیں عشق میں ایسے بھی سانحات
ہر سعی و ہر عمل میں محبت کا ہاتھ ہے
تعمیرِ زِندگی کے سمجھ کُچھ مُحرِّکات
مُجھ کو تو غم نے فُرصتِ غم بھی نہ دی فراق !
دے فُرصتِ حیات نہ جیسے غمِ حیات

۳

بڑا کرم ہے یہ مجھ پر، ابھی یہاں سے نہ جاؤ !
بہت اُداس ہے یہ گھر، ابھی یہاں سے نہ جاؤ
ابھی تو آئے ہو، دیکھا نہیں ہے جی بھر کے
یہ آرزو ہے، کہ اُٹھ کر ابھی یہاں سے نہ جاؤ

رُکے رہو، نگہِ نیم وا سے کچھ میں بھی
بنا لوں اپنا مقدر، ابھی یہاں سے نہ جاؤ

ابھی تو سوئے چراغوں نے آنکھ کھولی ہے
ابھی تو جاگتے ہیں گھر، ابھی یہاں سے نہ جاؤ

یہ وقتِ شام، یہ درماندگی، یہ سناٹا
یہ ظلمتوں کے سمندر، ابھی یہاں سے نہ جاؤ

رُکو رُکو! کہ پڑی ہے ابھی تو رات تمام
بہت اُداس ہے منظر، ابھی یہاں سے نہ جاؤ

ہماری رات چلی جائے گی تمھارے ساتھ
ہماری رات کو لے کر، ابھی یہاں سے نہ جاؤ

۴

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے، کہ جو تھا
وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے، کہ جو تھا

منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ دگراں ہے، کہ جو تھا

ظلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا
آج تک ایک دھندلکے کا سماں ہے، کہ جو تھا

جو بھی کر جور و ستم، جو بھی کر احسان و کرم
تجھ پہ اے دوست! وہی وہم و گماں ہے، کہ جو تھا

جان دے بیٹھے تھے اک بار ہوس والے بھی
پھر وہی مسئلۂ سود و زیاں ہے، کہ جو تھا

دیکھ سکنے کی الگ بات، مگر حسن ترا
دولتِ دیدۂ صاحب نظراں ہے، کہ جو تھا

تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراق!
آستینوں میں لیے کون و مکاں ہے، کہ جو تھا

۵

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر! پھر بھی
یہ حسن و عشق کا دھوکا ہے سب، مگر پھر بھی

ہزار بار زمانہ اِدھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی

خوشا اشارۂ پیہم! زہے سکوتِ نظر!
دراز ہو کے فسانہ ہے مختصر پھر بھی

پلٹ رہے ہیں غریب الوطن، پلٹنا تھا
وہ کوچہ روکشِ جنت ہو، گھر ہے گھر پھر بھی

تری نگاہ سے بچنے میں عمر گزری ہے
اُتر گیا رگِ جاں میں یہ نیشتر پھر بھی

اگرچہ بے خودیِ عشق کو زمانہ ہوا
فراق! کرتی رہی کام وہ نظر پھر بھی

۶

سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اِس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں، نہ بیگانوں میں
لیکن اُس جلوہ گہِ ناز سے اُٹھتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے، اے دوست!
آہ! اب مجھ سے تری رنجشِ بےجا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے، ایسا بھی نہیں

آہ! یہ مجمعِ احباب، یہ بزمِ خاموش
آج محفل میں فراقِ سخن آرا بھی نہیں

۷

رُکی رُکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی
وہ پَو پھٹی، وہ نئی زندگی نظر آئی

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ
مسافروں سے کہو، اُس کی رہ گزر آئی

فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی، لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی
اُمیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

کہاں ہر ایک سے اِنسانیت کا بار اُٹھا
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

ذرا وِصال کے بعد آئنہ تو دیکھ اے دوست!
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

۸

وہ شامِ اِنتظار کی بےتابیاں کہاں؟
شب ہائے غم میں بھی وہ درازی نہیں رہی

ہم زندہ ہیں ضرور، مگر اس کو کیا کریں؟
اب زندگی شریک ہماری نہیں رہی

تم سَو طرح سے آج بھی ہو مہرباں، مگر
مجھ پر وہ اب نگاہ تمھاری نہیں رہی

اب عشقِ یار کے وہ عجائب نہیں رہے
اب حُسن کی وہ عشوہ طرازی نہیں رہی

کرتے تھے جس پہ رشک زمانہ کے پختہ کار
اے دِل! وہ تیری خام خیالی نہیں رہی

جس دم فراقؔ! بزمِ سخن سے میں اٹھ گیا
تب سے غزل بھی گنجِ معانی نہیں رہی

۹

جولاں گہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں
منزل نہ کر! حدود سے دنیا بنی نہیں

مانا کہ تیرے لطف و کرم میں کمی نہیں
آسان اِس قدر تو تری دوستی نہیں

ہم دیکھ کر بھی دیکھ سکیں حُسنِ یار کو
اتنی طویل فرصتِ نظارگی نہیں

تاریخِ زندگی کے سمجھ کچھ محرکات
مجبور اتنی عشق کی بے چارگی نہیں

تکلیفِ عشق کو نہ بتا عیشِ جاوداں
غم کی شبِ دراز بھی اتنی بڑی نہیں

شامیں کسی کو مانگتی ہیں آج بھی فراقؔ!
گو زندگی میں یوں مجھے کوئی کمی نہیں

۱۰

کمی نہ کی ترے وحشی نے خاک اڑانے میں
جنوں کا نام اچھلتا رہا زمانے میں

جنوں سے بھول ہوئی دل پہ چوٹ کھانے میں
فراقؔ! دیر ابھی تھی بہار آنے میں

اب ان کو مہرِ قیامت کی آنکھیں ڈھونڈتی ہیں
ہوئے جو کھیت کسی کی حیا اٹھانے میں

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست!
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

ہمیں ہیں گل، ہمیں بلبل، ہمیں ہوائے چمن
فراقؔ! خواب یہ دیکھا ہے قید خانے میں

۱۱

دلِ گشتہ فریبِ تمنا ہے آج بھی
اس کی نگاہ اک نئی دنیا ہے آج بھی

افسردگیِ عشق کو مدت ہوئی، مگر
شعلہ سا کچھ دلوں سے لپکتا ہے آج بھی

گو بے حسیِ دل کو زمانہ گزر گیا
رہ رہ کے خارِ عشق کھٹکتا ہے آج بھی

نومیدیوں کی مدتِ دیرینہ پر نہ جا
اے چشمِ یار! تیرا بھروسا ہے آج بھی

اب بھی اچھل رہا ہے لہو سا فضا میں کچھ
دار و رسن پہ عشق کا قبضا ہے آج بھی

اس پرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے
کیا تو وہی خلوصِ سراپا ہے آج بھی

بدلے نگار خانۂ ہستی نے لاکھ رنگ
اندازِ حسنِ یار نرالا ہے آج بھی

گو ہو چکا ہے خاتمہ گفت و شنید کا
دلِ بے قرار شکوۂ بے جا ہے آج بھی

اب وہ متاعِ درد ہو، یا کیف یا نشاط
اس بزم میں خزانہ سا لٹتا ہے آج بھی

یوں تو فنا بقا کے منازل گزر چکے
دل ذکرِ عاشقی سے جھلکتا ہے آج بھی

سچ جھوٹ کی خبر تو کسے، لیکن اے فراقؔ!
کوئی بیانِ درد سناتا ہے آج بھی

۱۲

ہر کائنات سے یہ الگ کائنات ہے
حیرت سرائے عشق میں دن ہے نہ رات ہے

اب دورِ آسماں ہے، نہ دورِ حیات ہے
اے دردِ ہجر! تو ہی بتا کتنی رات ہے؟

توڑا ہے لامکاں کی حدوں کو بھی عشق نے
زندانِ عقل! تیری تو کیا کائنات ہے؟

ہستی کو تیرے درد نے کچھ اور کر دیا
یہ فرقِ مرگ و زیست تو کہنے کی بات ہے

یہ موشگافیاں ہیں گراں طبعِ عشق پر
کس کو دماغِ کاوشِ ذات و صفات ہے

عنوان غفلتوں کے ہیں، فرصت ہو یا وصال
بس فرصتِ حیات فراق! ایک رات ہے

۱۳

جن کو اتنا یاد کرو ہو، چلتے پھرتے سایے تھے
ان کو مٹے تو مدت گزری، نام و نشاں کیا پوچھو ہو؟

جانے بھی دو نام کسی کا آ گیا باتوں باتوں میں
ایسی بھی کیا چپ لگ جانا، کچھ تو کہو، کیا سوچو ہو؟

پہروں پہروں تک یہ دنیا بھولا سپنا بن جائے ہے
میں تو سراسر کھو جاؤں ہوں، یاد اتنا کیوں آؤ ہو؟

اتنی وحشت، اتنی وحشت، صدقے اچھی آنکھوں کے
تم نہ ہرن ہو، میں نہ شکاری، دور اتنا کیوں بھاگو ہو؟

پلکیں بند، السائی زلفیں، نرم سیج پر بکھری ہوئی
ہونٹوں پر اک موجِ تبسم، سوؤ ہو یا جاگو ہو؟

اکثر گہری سوچ میں ان کو کھویا کھویا پاویں ہیں
اب ہے فراق کا کچھ روزوں سے جو عالم کیا پوچھو ہو؟

۱۴

دعا سب کرتے آئے ہیں، دعا سے کچھ ہوا بھی ہو
دکھی دنیا کے بندے ان گنت، کوئی خدا بھی ہو

یہی ہے حُسن کی خوبی، یہی ہے شانِ محبوبی
زِ سرتا پا تغافل ہو، کوئی جانِ وفا بھی ہو

کہاں وہ خلوتیں دِن رات کی، اور اب یہ عالم ہے
کہ جب ملتے ہیں، دِل کہتا ہے کوئی تیسرا بھی ہو

تو پھر کیا عشق دُنیا میں کہیں کا بھی نہ رہ جائے؟
زمانے سے لڑائی مول لے۔ تجھ سے بُرا بھی ہو

فراق! اِنسان سے کیا فیصلہ ہو کُفر و ایماں کا
یہ غیرت خیز دُنیا، جب خُدا بھی، ماسوا بھی ہو

۱۵

زاہد! بُتوں کی دیکھ کبھی جلوہ باریاں
رہ جائیں گی دھری یہ عبادت گزاریاں

ہوں اِنتہا پسند بھی۔ با اعتدال بھی
ہیں اِختیار میں مری بے اختیاریاں

دربارِ عشق میں تھے ہزاروں اُمیدوار
کچھ عرضیاں قضا نے بھی آ کر گزاریاں

سرگوشیاں سی جیسے ہوں غیب و شہود میں
اے حُسنِ شرمسار! تری شرمساریاں

اے قلبِ سرنگوں! کبھی ہنس بول بھی ذرا
خوشیاں ہزار میں نے ترے در پہ واریاں

مے خانۂ سخن میں یہ راتیں نہ آئی تھیں
کچھ کام کر گئیں مری شب زندہ داریاں

۱۶

چھڑ گئے سازِ عشق کے گانے
کھُل گئے زندگی کے مے خانے

آج تو کفرِ عشق چونک اُٹھا
آج تو بول اُٹھے ہیں بُت خانے

کچھ گراں ہو چلا ہے بارِ نشاط
آج دُکھتے ہیں حُسن کے شانے

بعد مُدّت کے تیرے عشق میں پھر
آج بیٹھا ہوں دِل کو سمجھانے

حاصلِ حُسن و عشق بس ہے یہی
آدمی آدمی کو پہچانے

تو بھی آمادۂ سفر ہو فراقؔ!
قافلے اُس طرف لگے جانے

۱۷

آنکھوں میں جو بات ہو گئی ہے
اِک شرحِ حیات ہو گئی ہے

کیا جانیے؟ موت کیا تھی پہلے؟
اب میری حیات ہو گئی ہے

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

جس چیز کو چھو دیا ہے تو نے　　اِک برگِ نبات ہو گئی ہے
ایک ایک صفت فراق! اُس کی　　دیکھا ہے تو ذات ہو گئی ہے

۱۸

وہ خبر ملی، وہ نظر ملی، ترے حسنِ عشوہ طراز میں
کہ کہاں ہے علم و ہنر میں وہ؟ جو ہے تیرے شیوۂ ناز میں
یہ نہ پوچھ کتنا جیا ہوں میں؛ یہ نہ پوچھ کیسے جیا ہوں میں؛
کہ ابد کی آنکھ بھی لگ گئی، مرے غم کی شام دراز میں
مری منزلوں کا تو ذکر کیا؛ مری گرد کو بھی نہ پا سکیں
جو فضا میں جذب تھیں بجلیاں، وہ ہیں آج تک تگ و تاز میں
ہیں ہر ایک عہد کا راز داں، ہیں فراق شہری ہر زماں
جو خیال و خواب ہیں صدیوں کے، وہ ہیں میرے قلبِ گداز میں

۱۹

ہیں نغمہ و نشاط بھی، فریاد و آہ بھی　　ماتم کدہ بھی دل ہے، تری جلوہ گاہ بھی
خاطر میں ایسے ویسوں کو لائی نہ آج تک　　اونچی ہے کس قدر، تری نیچی نگاہ بھی؟
اے شیخ! کاش تیری سمجھ میں یہ راز آئے　　ہیں کچھ بُرے ثواب، کچھ اچھے گناہ بھی
عالم، ازل سے تا بہ ابد ہے گراں سکوت　　لیکن نکل ہی جاتی ہے کچھ آہ آہ بھی
محوِ خطاب، ناصحِ مشفق ہوں اے فراق!　　کچھ مجھ سے کہہ رہی ہے وہ چشمِ سیاہ بھی

۲۰

یہ کہہ کے کل کوئی بے اختیار روتا تھا　　وہ اِک نگاہ سہی، کیوں کسی کو دیکھا تھا؟
کسی کے ہاتھ نہ آیا سوائے غفلتِ ہوش　　ہر اک کو اپنے سے بیگانہ وار جینا تھا
کچھ ایسی بات نہ تھی تجھ سے دور ہو جانا　　یہ بات الگ ہے کہ رہ رہ کے درد ہوتا تھا
نہ پوچھو سود و زیاں کاروبارِ الفت کا　　وگرنہ یوں تو نہ کھونا تھا، کچھ نہ پانا تھا

لگاوٹیں وہ ترے حُسنِ بے نیاز کی آہ! — مَیں تیری بزم سے جب ناامید اٹھا تھا
ہر ایک سانس ہے تجدیدِ یادِ ایامے — گزر گیا وہ زمانہ ، جِسے گزرنا تھا
کہاں یہ چونک ہُوئی تیرے بے قراریں سے؟ — زمانہ دُوسری کروٹ بدلنے والا تھا
نہ کوئی وعدہ ، نہ کوئی یقیں ، نہ کوئی اُمید — مگر ہمیں تو ترا اِنتظار کرنا تھا

۲۱

نیرنگِ حُسنِ یار! ترے بس میں کیا نہیں؟ — لُطف و کرم تو مانعِ جور و جفا نہیں
کس درجہ پردہ دار طلسمِ نگاہ ہے — اِس بزم میں کسی کو کسی کا پتا نہیں
میرے سکوتِ یاس پہ اِتنا نہ ہو ملول — مجھ کو خدا نخواستہ تجھ سے گِلا نہیں
نیرنگیِ اُمیدِ کرم اُن سے پُوچھیے — جن کو جفائے یار کا بھی آسرا نہیں
تھا حاصلِ پیام ترا اے نگاہِ ناز! — وہ رازِ عاشقی ، جسے تُو نے کہا نہیں
مَیں شاد کامِ دید بھی ، محرُومِ دید بھی — ہوتا ہے جب وہ سامنے ، کچھ سُوجھتا نہیں
اُس رہ گزار پہ ہے رواں کاروانِ عشق — کوسوں جہاں کسی کو خود اپنا پتا نہیں

ترکِ محبت کرنے والو! کون ایسا جگ جیت لیا؟
عشق سے پہلے کے دِن سوچو! کون بڑا سکھ ہوتا تھا؟
اُس کے آنسو کس نے دیکھے؟ اُس کی آہیں کس نے سُنیں؟
چمن چمن تھا حُسن بھی لیکن دریا دریا روتا تھا
پچھلا پہر تھا ہجر کی شب کا ، جاگتا رب ، سوتا سنسار
تاروں کی چھاؤں میں کوئی فراق سا جیسے موتی پروتا تھا

آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے — آج تو کوئی آیا ہوتا
منزل منزل دِل بھٹکے گا — آج تو تم نے روکا ہوتا

شام بھی تھی دھواں دھواں، حُسن بھی تھا اُداس اُداس
دِل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

تاروں کی آنکھ بھی بھر آئی میری صدائے درد پر
اُن کی نگاہیں بھی ترا نام بتا کے رہ گئیں

کون سکون دے سکا غم زدگانِ عشق کو؟
بھیگتی راتیں بھی فراقؔ! آگ لگا کے رہ گئیں

یوں ہی سا تھا کوئی، جس نے مجھے مٹا ڈالا
نہ کوئی نور کا پُتلا، نہ کوئی زہرہ جبیں
ہزار شکر کہ مایوس کر دیا تو نے
یہ اور بات کہ تجھ سے بڑی اُمیدیں تھیں
ہُنر تو خیر ہُنر، عیب سے بھی جلتے ہیں
فغاں، کہ اہلِ زمانہ ہیں کس قدر کم بیں

یہ معمہ کوئی حل کر نہ سکا، واویلا!
ایک معصوم نظر کر گئی دُنیا کو خراب
کیا ہے یہ سوزِ دروں، کون سی ٹیس اُٹھتی ہے؟
از ازل تا بہ ابد دیدۂ انجم بے خواب
اکثر اے چشمِ کرم! مجھ کو یہ ڈر لگتا ہے
کیسے لاؤں گا تری مہر و مراعات کی تاب؟

پختگی سے بڑھ کے کوئی شے دو عالم میں نہیں
اے غمِ جاناں! خود اپنی آنچ میں کچھ اور پک
خضر خود کھو جائیں، تجھ کو ڈھونڈنے نکلیں اگر
اے دِلِ آوارہ! تو اِتنا بھٹک، اِتنا بھٹک
اب نگاہِ ناز کچھ مانوس مجھ سے ہو چلی
اِک ذرا باقی جو ہے وہ بھی نکل جائے جھجک

فریبِ صبر کھا کر موت کو ہستی سمجھ بیٹھے
نہ آیا بے قراری کو حیاتِ جاوداں ہونا
ہر آوازِ جرس پر اِک صدائے بازگشت آئی
بہت ہے اِس قدر بھی فیر، یادِ رفتگاں ہونا

یہ کہاں سے بزمِ خیال میں اُمنڈ آئیں چہروں کی ندیاں؟
کوئی مہ چکاں، کوئی خور فشاں، کوئی زہرہ وش، کوئی شعلہ رُو
تجھے اہلِ دل کی خبر نہیں کہ جہاں ہیں گنج لُٹا گئے
یہ گداگرانِ دیارِ غم، یہ قلندرانِ تہی کدو

عشق میں سچ ہی کا رونا ہے   جھوٹے نہیں تم، جھوٹے نہیں ہم

میں بھی سچا، تم بھی سچے   عشق میں سچ ہی کا رونا تھا

یہاں خود اپنا فریبِ نگاہ کیا کم ہے؟   یہ کیا ضرور ہے؟ اُس کی نظر کے دھوکے کھا

زندگی کیا ہے؟ آج اُسے اے دوست!   سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

آئے گنہگارانِ محبت   نادم نادم، نازاں نازاں

بھلائیوں کی تو کیا بات؟ رو پڑا ہوں میں   جو یاد آ گئیں مجھ کو بُرائیاں تیری

پوچھ مت کیفیتیں اُن کی، نہ پوچھ اُن کا شمار   چلتی پھرتی ہیں مرے سینے میں جو پرچھائیاں

نئی زمین، نیا آسماں، نئی دنیا   سُنا تو ہے کہ محبت کو اِن دنوں ہے فراغ

نہ رہا حیات کی منزلوں میں وہ فرقِ ناز و نیاز بھی
کہ جہاں ہے عشق برہنہ پا، وہیں حُسن خاک بسر بھی ہے

یہی رِندوں کی دُعا ہے سرِ مے خانہ ترا   ساقیا جام چلے، کام چلے، نام چلے

غم بھی ہے جزوِ زندگی، لیکن زندگی اشک اور آہ نہیں

اپنے مقام پر رہیں عشق کی بے نیازیاں گو، درِ خلد بھی کھلا، دل نے کہا کہ کون جائے

رنج و راحت، وصل و فرقت، ہوش و وحشت کیا نہیں؟ کون کہتا ہے کہ رہنے کی جگہ دنیا نہیں

کس لیے کم نہیں ہے دردِ فراق! اب تو وہ دھیان سے اُتر بھی گئے

دیکھ آئے آج یادوں کا نگر زندگی پرچھائیاں پرچھائیاں

یوں تو رونے سے کچھ نہیں ہوتا جی نہیں مانتا، تو کیا کیجے؟

کس کو روتا ہے عمر بھر کوئی؟ آدمی جلد بھول جاتا ہے

اتنا نہ ہو بے قرار اے دل! خود کو بھی تو کچھ سنبھالتے ہیں

تھا ذکرِ کرم فراق! اس کا کیوں آنکھ لگی ہے ڈبڈبانے؟

دکھا تو دیتی ہے بہتر حیات کے سپنے خراب ہو کے بھی یہ زندگی خراب نہیں

دل دکھ کے رہ گیا وہ الگ بات تھی، مگر ہم بھی ترے خیال سے مسرور ہو گئے

اک فسوں ساماں نگاہِ آشنا کی دیر تھی اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

تمام شبنم و گل ہے وہ سر سے تا بہ قدم رکے رکے سے کچھ آنسو، رکی رکی سی ہنسی

کوئی آیا نہ آئے گا، لیکن کیا کریں؟ گر نہ انتظار کریں

کوئی افسانہ چھیڑ، تنہائی! رات کٹتی نہیں جدائی کی

حُسن اِک خوابِ ناز ہے، جس کے
چونک پڑنے کو عشق کہتے ہیں

نگاہِ یار کچھ ایسی پھری ہجراں نصیبوں سے
کہ اب تو جس کا جی چاہے، وہی غم خوار ہو جائے

اُمورِ عذرِ جفا تک خیال جا نہ سکا
میں چپ رہا، تو بُرا ماننے کی بات نہ تھی

فیصلہ عشق کی تقدیر میں ہونا معلوم
آپ نے کچھ مگر اِس باب میں سوچا بھی کہاں!

کون اے دوست! اتنا پیارا ہے؟
ہم سوا تیرے کس کو پیار کریں؟

جسم اُس کا نہ پوچھیے، کیا ہے؟
ایسی نرمی تو رُوح میں بھی نہیں

کچھ ایسے بھی اُٹھ جائیں گے اِس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلوگے، مگر پا نہ سکوگے

وحدت و کثرت اُسی کے جلوے ہیں آنکھیں تو کھول!
زندگی خلوت کی خلوت، انجمن کی انجمن

سوزِ نہاں میں وہ قرار، قلبِ تپاں میں وہ صفا
شعلہ تو تھا، تڑپ نہ تھی، آگ تو تھی، دھواں نہ تھا

جیسے ڈس لیا ہو زمانے نے، کوئی زندگی ہے یہ زندگی
یہ سوادِ شام اجل اجل، یہ ضیائے صبح کفن کفن

تو نہ چاہے، تو تجھے پا کے بھی ناکام رہیں
تو جو چاہے، تو غمِ ہجر بھی آساں ہو جائے

تمام خستگی و ماندگی ہے عالمِ ہجر
تھکے تھکے سے یہ تارے، تھکی تھکی سی یہ رات

گردشِ آسماں سے ڈرتا ہوں
بڑھ چلا تیرا اعتبار بہت

چُپ ہو گئے تیرے رونے والے
دُنیا کا خیال آ گیا ہے

فضا تبسّمِ صبحِ بہار تھی، لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

حُسن کو اِک حُسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراقؔ!
مہرباں نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم؟

آج آنکھوں میں کاٹ دے شبِ ہجر
زندگانی پڑی ہے، سو لینا

یوں سمجھ بیٹھے تھے، گویا بھول بیٹھے ہیں تجھے
رات تیری یاد سے دِل میں وہ درد اُٹھا کہ بس

حسرتِ دل کو مرے سمجھے وہی خستہ، جسے
یار نے آ کے دمِ بازپسیں دیکھا ہے

وہ نوبہارِ ناز اُٹھا، فضائے صبح جاگ اُٹھی
وہ تازگی، وہ حُسن، وہ نکھار، وہ صباحتیں

ترے خیال کی رنگینیوں کا کیا کہنا؟
فضا میں جیسے گلابی سی کوئی چھلکائے

لُطف و ستم، وفا، جفا، یاس و اُمید، قرب و بُعد
عشق کی عمر کٹ گئی چند توہمات میں

ہم سے کیا ہو سکا محبّت میں؛
تم نے تو خیر بے وفائی کی

کہاں اِتنی خبر؛ عمرِ محبّت کس طرح گزری؛
ترا ہی درد تھا دِل میں، جہاں تک یاد آتا ہے

تیرہ بختی نہیں جاتی دِلِ سوزاں کی فراقؔ!
شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

حیات ہو کہ اجل، سب سے کام لے غافل!
کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں، دراز بھی ہے

تم مخاطب بھی ہو، قریب بھی ہو
تم کو دیکھوں، کہ تم سے بات کروں؟

کوئی سمجھے تو ایک بات کہوں
عشق توفیق ہے، گناہ نہیں

دِل جو مارا گیا فراقؔ! تو کیا
زندگی بھر اُسی کا ماتم ہو؟

ایک کو ایک کی خبر منزلِ عشق میں نہ تھی
کوئی بھی اہلِ کارواں شاملِ کارواں نہ تھا

ابھی کچھ اور ہو انسان کا لہو پانی
ابھی حیات کے چہرے پہ آب و تاب نہیں

بات یہ ہے کہ سکونِ دلِ وحشی کا مقام
کنجِ زنداں بھی نہیں، وسعتِ صحرا بھی نہیں

عہد و پیماں کوئی اے حُسن بھی کیا کرے؟
عشق بھی تو ہے کچھ بدگماں بدگماں

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اُٹھتا ہے
بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

تُمھیں تو اہلِ ہوس! امتحاں سے بھاگ چلے
یہ کیا ضرور کہ ہوتی تو موت ہی ہوتی

فراقؔ! ایک ہوئے جاتے ہیں زمان و مکاں
تلاشِ دوست میں مَیں بھی کہاں نکل آیا؟

رُکا ہے قافلۂ غم کب ایک منزل پر؟
کب انقلاب، زمانہ کا ہم رکاب نہیں؟

ہُوا ہے گردشِ دوراں کا ایک دَور تمام
سکونِ یاس جو حاصل ہُو محبت کو

اس بزمِ بے خودی میں وجود و عدم کہاں؟
چلتی نہیں ہے سانس حیات و ممات کی

جہاں بھی جستجوئے دوست میں ٹھہر جاتے
یقین جان! کہ منزل قریب ہی ہوتی

تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہُوا
اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اُٹھے

نشاطِ حُسنِ ازل کو بھی وجد آجاتا
دُکھی ہُوئی مگر اتنی رگِ حیات نہیں

کیا ہے صبر گو زندگی میں رخ ہستی
ترے خیال سے ٹکرا کے رہ گیا ہوں میں

یارب! جو یہ دی سزائے ہستی
آخر کوئی قصور میرا؟

ترا وِصال بڑی چیز ہے، مگر اے دوست!
وِصال کو مری دُنیائے آرزو نہ بنا

کُچھ اِنتظار کا عُنوان تو بدل جاتا
جو غم کی شام ہُوئی تھی، تو صُبح بھی ہوتی

دِل دُکھے روئے ہیں شاید اِس جگہ اے کوئے دوست!
خاک کا اِتنا چمک جانا ذرا دُشوار تھا

عجب کیا؟ کھوئے کھوئے سے جو رہتے ہیں ترے آگے
ہمارے درمیاں اے دوست! لاکھوں خواب حائل ہیں

رونے کو تو زِندگی پڑی ہے
کُچھ تیرے سِتم پہ مُسکرا لیں

یہ زِندگی کے کڑے کوس، یاد آتا ہے
تری نِگاہِ کرم کا گھنا گھنا سایہ

اُس نے کی پرسشِ حالات، تو مُنہ پھیر لیا
دِلِ غم گیں کے یہ انداز، خُدا خیر کرے

خُدا گواہ کہ عورت ہے ملکۂ آفاق
یہ مہر و ماہ و کواکب سب اُس کے باج گزار

تری بے نیازی سے، کُچھ ہم بھی کہتے
مگر کون اے دوست! بات اپنی کھوئے؟

بزمِ مے بے خُود و بے تاب نہ ہو کیوں، ساقی!
مَوجِ بادہ ہے کہ درد اُٹھتا ہے پیمانوں میں؟

تیرے خِرامِ ناز سے آج وہاں چمن کِھلے
فصلیں بہار کی جہاں خاک اُڑا کے رہ گئیں

دِلوں کو تیرے تبسُّم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اُٹھیں جس طرح مندِروں کے چراغ

اے دِلِ بے قرار دیکھ! وقت کی کارسازِیاں
عِشق کو صبر آگیا، صبر کیے بغیر بھی

راستے بند ہیں، فرار محال
کیا کریں؟ اہلِ غم کہاں جائیں؟

ہوئی ختم صحبتِ مے کشی، یہی داغ سینوں میں لے چلے
کہ طلوع ہونے سے رہ گئے کئی آفتابِ خُم و سبُو

کبھی ہو سکا، تو بتاؤں گا، تجھے رازِ عالمِ خیر و شر
کہ میں رہ چکا ہوں شروع ہی سے تجھے ایزد و تجھے اہرمن

دِل چاہتا ہے وعدۂ جاناں کو اُستوار
اے وائے! عشق میں کبھی اگر اِنتظار ہو

اب ماورائے وہم و گماں ہے سکوتِ ناز
وہ سُن چکے فسانۂ غم، ہم سُنا چکے

اے فِراق! اُنھیں پا کے ہم یہ دِل میں کہتے ہیں
سوچیے تو مُشکل ہے، دیکھیے تو آساں ہے

جلوۂ حُسن نثارِ غمِ پنہاں کر دے
عشق توفیق جو دے، وصل کو ہجراں کر دے

صد مہر و قمر اُس میں جھلک جاتے ہیں ساقی!
اِک بوند مئے ناب میں صد عالمِ اِمکاں

نیرنگِ روزگار میں کیفِ دوام دیکھ
ساقی کی مست آنکھ سے گردِش میں جام دیکھ

لُٹا دے ظلمت اپنی، عام کر دے روشنی اپنی
حیات اپنی، مَمات اپنی، ملال اپنا، خوشی اپنی

کون ترغیبِ ہوش دے؟ کہ جنوں
بے خبر بھی ہے، ہوشیار بھی ہے

فیض ۔ فیض احمد   ولادت ۱۹۱۱ء

شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی   شکر ہے، زندگی تباہ نہ کی
تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے   تجھ کو چاہا، تو اور چاہ نہ کی
تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں   دل ہی کافر تھا، جس نے آہ نہ کی
تھے شبِ ہجر اور کام بہت   ہم نے فکرِ دلِ تباہ نہ کی
کون قاتل بچا ہے شہر میں ؛ فیض !   جس سے یاروں نے رسم و راہ نہ کی

(۲)

بات بس سے نکل چلی ہے   دل کی حالت سنبھل چلی ہے
اب جنوں حد سے بڑھ چلا ہے   اب طبیعت بہل چلی ہے
اشک خوں ناب ہو چلے ہیں   غم کی رنگت بدل چلی ہے
یوں ہی بجھ رہی ہیں شمعیں   یا شبِ ہجر ٹل چلی ہے
لاکھ پیغام ہو گئے ہیں   جب صبا ایک پل چلی ہے
جاؤ، اب سو رہو ستارو !   درد کی رات ڈھل چلی ہے

(۳)

آئے کچھ ابر، کچھ شراب آئے   اس کے بعد آئے، جو عذاب آئے
بامِ مینا سے ماہتاب آئے ق   دستِ ساقی میں آفتاب آئے
ہر رگِ خوں میں پھر چراغاں ہو   سامنے پھر وہ بے حجاب آئے
عمر کے ہر ورق پہ، دل کو نظر   تیری مہر و وفا کے باب آئے
کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب ق   آج تم یاد بے حساب آئے
نہ گئی تیرے غم کی سرداری   دل میں یوں روز انقلاب آئے
جل اٹھے بزمِ غیر کے در و بام   جب کبھی ہم خانماں خراب آئے

اس طرح اپنی خامشی گونجی — گویا ہر سمت سے جواب آئے
فیض! تھی راہ سر بسر منزل — ہم جہاں پہنچے، کامیاب آئے

(۴)

خیالِ یار، کبھی ذکرِ یار کرتے رہے — اِسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے
ہمیں شکایتِ ہجراں، کہ اِس وسیلے سے — ہم اُن سے رشتۂ دل اُستوار کرتے رہے
وہ دِن، کہ کوئی بھی جب وجہِ انتظار نہ تھی — ہم اُن میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے
ہم اپنے راز پہ نازاں تھے، شرمسار نہ تھے — ہر ایک سے سخنِ رازدار کرتے رہے
انھیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے — جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

(۵)

تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں — کسی بہانے تمھیں یاد کرنے لگتے ہیں
حدیثِ یار کے عنواں اُبھرنے لگتے ہیں — تو ہر حریم میں، گیسو سنورنے لگتے ہیں
ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے — جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں
صبا سے کرتے ہیں، غربت نصیب، ذکرِ وطن — تو چشمِ صبح میں آنسو اُبھرنے لگتے ہیں
وہ جب بھی کرتے ہیں اِس نطق و لب کی بخیہ گری — فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں
درِ قفس پہ اندھیرے کی مُہر لگتی ہے — تو فیض! دِل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں

(۶)

ایسے ناداں بھی نہ تھے، جاں سے گزرنے والے — ناصحو! پند گرو! راہ گزر تو دیکھو!
وہ تو وہ ہے، تمھیں ہو جائے گی اُلفت مجھ سے — اِک نظر، تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو!
وہ جو اب چاک گریباں بھی نہیں کرتے ہیں — دیکھنے والو! کبھی اُن کا جگر تو دیکھو!
دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے — آؤ! اِک دن دلِ پُرخوں کا ہنر تو دیکھو!

صبح کی طرح جھمکتا ہے شبِ غم کا اُفق
فیض! تابندگیِ دیدۂ تر تو دیکھو!

(۷)

تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر، بار بار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو، جس شب
وہ شب، ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات، سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات، اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گُل کھلے ہیں، نہ اُن سے ملے، نہ مَے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن میں غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری؟
قفس میں آج صبا بے قرار گزری ہے

(۸)

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

ویراں ہے مے کدہ، خُم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے، کہ رُوٹھ گئے دِن بہار کے

اِک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دِن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دُنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دِیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں، غم روزگار کے

بھُولے سے مسکرا تو دِیے تھے وہ آج، فیضؔ!
مت پوچھ ولولے، دلِ ناکردہ کار کے

(۹)

گُلوں میں رنگ بھرے، بادِ نَوبہار چلے
چلے بھی آؤ! کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اُداس ہے یارو! صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خُدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صُبح ترے کُنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب، سرِ کاکُل سے مُشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دِل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے، غمگسار چلے

جو ہم پہ گُزری سو گُزری، مگر شبِ ہجراں!
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضُورِ یار ہُوئی دفترِ جُنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقام، فیضؔ! کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے، تو سوئے دار چلے

(۱۰)

عجزِ اہلِ ستم کی بات کرو!
عشق کے دَم قدم کی بات کرو!

بزمِ اہلِ طرب کو شرماؤ ! بزمِ اصحابِ غم کی بات کرو!
بامِ ثروت کے خوش نشینوں سے عظمتِ چشمِ نم کی بات کرو!
ہے وہی بات، یوں بھی اور یوں بھی تم ستم یا کرم کی بات کرو؟
خیر ہیں اہلِ دیر، جیسے ہیں آپ اہلِ حرم کی بات کرو!
ہجر کی شب تو کٹ ہی جائے گی روزِ وصلِ صنم کی بات کرو!
جان جائیں گے، جاننے والے فیضؔ: فرہاد و جم کی بات کرو!

(۱۱)

ہمتِ التجا نہیں باقی ضبط کا حوصلہ نہیں باقی
اک تری دید چھن گئی مجھ سے ورنہ دُنیا میں کیا نہیں باقی؟
اپنی مشقِ ستم سے ہاتھ نہ کھینچ! میں نہیں، یا وفا نہیں باقی
تیری چشمِ الم نواز کی خیر* دِل میں کوئی گلا نہیں باقی
ہو چکا ختم عہدِ ہجر و وصال زندگی میں مزا نہیں باقی

(۱۲)

چشمِ مے گوں ذرا اِدھر کر دے! دستِ قدرت کو بے اثر کر دے!
تیز ہے آج دردِ دل، ساقی! تلخیِ مے کو تیز تر کر دے!
جوشِ وحشت ہے تشنہ کام ابھی چاک دامن کو تا جگر کر دے!
میری قسمت سے کھیلنے والے! مُجھ کو قسمت سے بے خبر کر دے!
لُٹ رہی ہے مری متاعِ نیاز کاش وہ اِس طرف نظر کر دے!
فیضؔ! تکمیلِ آرزو معلوم ہو سکے تو یوں ہی بسر کر دے!

(۱۳)

عشق، منت کشِ قرار نہیں حُسن، مجبورِ انتظار نہیں
تیری رنجش کی اِنتہا معلوم حسرتوں کا مری شُمار نہیں

اپنی نظریں بکھیر دے ساقی :
مے بہ اندازۂ خمار نہیں

زیرِ لب ہے ابھی تبسّمِ دوست
منتشر جلوۂ بہار نہیں

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

فیضؔ زندہ رہیں، وہ ہیں تو سہی
کیا ہوا؟ گر وفا شعار نہیں

(۱۴)

خوش ہوں فراقِ قامت و رخسارِ یار سے
سرو و گلِ سمن سے نظر کو ستائیں ہم

ویرانیٔ حیات کو ویران تر کریں
لے ناصح! آج تیرا کہا مان جائیں ہم

پھر اوٹ لے کے دامنِ ابرِ بہار کی
دل کو منائیں ہم، کبھی آنسو بہائیں ہم

سلجھائیں بے دلی سے، یہ الجھے ہوئے سوال
واں جائیں یا نہ جائیں، نہ جائیں کہ جائیں ہم؟

آؤ! کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اب ختمِ عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

(۱۵)

گرانیٔ شبِ ہجراں دوچند کیا کرتے؟
علاجِ درد، ترے درد مند کیا کرتے؟

وہیں لگی ہے، جو نازک مقام تھے دل کے
یہ فرق، دستِ عدو کے گزند کیا کرتے؟

جگہ جگہ پہ تھے ناصح، تو کو بہ کو دلبر
انھیں پسند، انھیں ناپسند کیا کرتے؟

جنھیں خبر تھی، کہ شرطِ نوا گری کیا ہے؟
وہ خوش نوا گلۂ قید و بند کیا کرتے؟

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سر بلند، کیا کرتے؟

(۱۶)

حسن، مرہونِ جوشِ بادۂ ناز
عشق منت کشِ فسونِ نیاز

دل کا ہر تار، لرزشِ پیہم
جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز

سوزشِ دردِ دل کسے معلوم؟
کون جانے کسی کے عشق کا راز؟

میری خاموشیوں میں لرزاں ہے
میرے نالوں کی گم شدہ آواز

تو ہے اور اک تغافلِ پیہم
میں ہوں اور انتظارِ بے انداز

خوفِ ناکامیِ اُمید ہے فیضؔ!
ورنہ، دِل توڑ دے طِلسمِ مجاز

(۱۷)

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی، ترے جاں نثار چلے گئے
تری راہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہگزار چلے گئے

تری کج ادائی سے ہار کے، شبِ اِنتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے رُوٹھ کر، مرے غمگسار چلے گئے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں، نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اِختیار چلے گئے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر، سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم، سرِ بزمِ یار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رُخِ وفا، یہ رسن، یہ دار کرو گے کیا؟
جنھیں جُرمِ عشق پہ ناز تھا، وہ گُناہ گار چلے گئے

(۱۸)

یک بہ یک شورشِ فغاں کی طرح
فصلِ گُل آئی اِمتحاں کی طرح

صحنِ گُلشن میں بہرِ مُشتاقاں
ہر روش کھنچ گئی کماں کی طرح

پھر لہو سے ہر ایک کاسۂ داغ
پُر ہُوا جامِ ارغواں کی طرح

یاد آیا جُنونِ گُم گشتہ
بے طلب، قرضِ دوستاں کی طرح

جانے کس پر ہو؟ مہرباں قاتل
بے سبب، مرگِ ناگہاں کی طرح

ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں
دِل سنبھالے رہو، زباں کی طرح

(۱۹)

شرحِ فراق، مدحِ لبِ مُشک بُو کریں
غُربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں؟

یار آشنا نہیں کوئی، ٹکرائیں کس سے جام؟ کس دلربا کے نام پہ خالی سبو کریں؟
سینے پہ ہاتھ ہے، نہ نظر کو تلاشِ بام دل ساتھ دے تو آج غمِ آرزو کریں
کب تک سنے گی رات؟ کہاں تک سنائیں ہم؟ شکوے گلے سب آج ترے روبرو کریں
ہمدم! حدیثِ کوئے ملامت سنائیو! دل کو لہو کریں، کہ گریباں رفو کریں
آشفتہ سر ہیں، محتسبو! منہ نہ آئیو! سر بیچ دیں، تو فکرِ دل و جاں عدو کریں

(۲۰)

کب ٹھہرے گا درد؟ اے دل! کب رات بسر ہوگی؟ سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی
کب جان لہو ہوگی؟ کب اشک گہر ہوگا؟ کس دن تری شنوائی، اے دیدۂ تر! ہوگی؟
کب مہکے گی فصلِ گل؟ کب بہکے گا میخانہ؟ کب صبحِ سخن ہوگی؟ کب شامِ نظر ہوگی؟
واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہوگی؟
کب تک ابھی رہ دیکھیں؟ اے قامتِ جانانہ! کب حشر معیّن ہے؟ تجھ کو تو خبر ہوگی؟

(۲۱)

قرضِ نگہِ یار ادا کر چکے ہیں ہم سب کچھ نثارِ راہِ وفا کر چکے ہیں ہم
اب احتیاط کی کوئی صورت نہیں رہی قاتل سے رسم و راہ سوا کر چکے ہیں ہم
اب اپنا اختیار ہے، چاہے جہاں چلیں رہبر سے اپنی راہ جدا کر چکے ہیں ہم
ان کی نظر میں، کیا کریں، پھیکا ہے اب بھی رنگ جتنا لہو تھا، صرفِ قبا کر چکے ہیں ہم
کچھ اپنے دل کی خو کا بھی شکرانہ چاہیے سو بار ان کی خو کا گلا کر چکے ہیں ہم

(۲۲)

یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں جب چاہا کر لیا ہے، کنجِ قفس بہاراں
آنکھوں میں دردمندی، ہونٹوں پہ عذر خواہی جانانہ وار آئی، شامِ فراقِ یاراں
ناموسِ جان و دل کی بازی لگی تھی، ورنہ آساں نہ تھی کچھ ایسی، راہِ وفا شعاراں
مجرم ہو خواہ کوئی، رہتا ہے ناصحوں کا روئے سخن ہمیشہ سوئے جگر فگاراں

ہے اب بھی وقت زاہد! ترمیمِ زُہد کر لے　　سوئے حرم چلا ہے انبوہِ بادہ خوار
آئے گی فیض اِک دن یادِ بہار لے کر　　تسلیمِ مے فروشاں، پیغامِ مے گ

تیرے در تک پہنچ کے لوٹ آئے　　عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے
ساری دُنیا سے دُور ہو بیٹھے　　جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے

کئی بار اُس کا دامن بھر دیا حُسنِ دو عالم سے　　مگر دِل ہے کہ اِس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی
نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی　　متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

متاعِ لوح و قلم چھن گئی، تو کیا غم ہے؟　　کہ خونِ دِل میں ڈبولی ہیں انگلیاں مَیں نے
زباں پہ مُہر لگی ہے، تو کیا، کہ رکھ دی ہے　　ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں مَیں نے

رات یوں دِل میں تری کھوئی ہُوئی یاد آئی　　جیسے ویرانے میں چُپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم　　جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

دِل رہینِ غمِ جہاں ہے آج　　ہر نفس، تشنۂ فغاں ہے آج
سخت ویراں ہے محفلِ ہستی　　اے غمِ دوست! تو کہاں ہے آج؟

اُٹھ کر تو آگئے ہیں تری بزم سے، مگر　　کچھ دِل ہی جانتا ہے کہ کس دِل سے آئے ہیں

آج اُن کی نظر میں کچھ ہم نے　　سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا

کیا جانے کس کو کس سے ہے اب داد کی طلب؟　　وہ غم جو میرے دِل میں ہے، تیری نظر میں ہے

MUNTAKHAB GHAZLEN

Rs. 7/-